بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لمعات

عدل اور استبداد

انسانوں کے مفاد ہمیشہ آپس میں ٹکراتے چلے آئے ہیں اور اس ٹکراؤ سے باہمی کشمکش اور تنازعات کا سلسلہ قائم رہتا ہے۔حکومت کے قیام کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ ایسے معاملات کو حسن وخوبی اور عدل وانصاف سے نپٹایا جائے لیکن عام طور پر دیکھا یہی گیا ہے کہ حکمرانی کی لذت اور اقتدار کا چسکہ حکمرانوں کو ایک دوسری راہ پر ڈال دیتا ہے۔ جہاں عدل وانصاف اور فہم وبصیرت کی بجائے اپنی ذمہ داریوں سے بے نیاز ہو کر' وہ ہواء وحرص اور خود غرضی کا سہارا لیتے ہیں اور ہر قسم کی جواب دہی سے روگردانی اختیار کر لیتے ہیں۔اسی مطلق العنانی کا دوسرا نام استبداد ہے۔فرعون اسی استبداد کا مجسمہ تھا۔ دوسری طرف پیشوائیت کا استبداد ہے جس کی گرفت انسانی ذہن پر ہوتی ہے اور ہامان اسی استبداد کا مجسمہ تھا اور پھر سرمایہ داری کا استبداد ہے جو انسان کی اخلاقی جرأتوں کو پامال کرتا ہے۔ قارون اسی استبداد کا مجسمہ تھا۔قرآن کریم میں داستان بنی اسرائیل میں فرعون' ہامان اور قارون کا ذکر دراصل تاریخ انسانی کے استبداد کی داستان ہے اور تاریخ انسانی میں جہاں جہاں استبداد نظر آئے گا وہ اس زمانے کے فرعونوں' ہامانوں اور قارونوں کی وجہ سے ہوگا اور ان کے باہمی گٹھ جوڑ سے ہوگا۔ اس لئے یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس استبداد کو سمجھنے کی کوشش کی جائے جس نے انسانیت کی تاریخ میں ہمیشہ تباہیاں مچائی ہیں اور اس بات کا جائزہ لیا جائے کہ عہد استبداد میں معاشرے کی شکل وصورت کیا ہوتی ہے۔استبداد انسانی تمدن پر کیا اثرات چھوڑتا ہے۔اور خود مستبد لوگوں کی زندگی کیسی گزرتی ہے تاکہ اس پس منظر میں عدل ومساوات کے صحیح خط وخال نظر آسکیں۔ واضح رہے کہ استبداد سے متعلق ہماری یہ تصریحات تاریخ عالم کے مطالعہ کا نتیجہ ہے اور کسی ایک ملک' ایک قوم' ایک مملکت یا ایک حکمران تک محدود یا مختص نہیں۔ یوں سمجھئے کہ جو کچھ ہم کہہ رہے ہیں اس کا تعلق' استبداد کی نفسیات سے ہوگا۔ کسی خاص مستبد ''چیف'' یا ''چیفس'' سے نہیں ہے۔

استبداد میں حکومت یا تو کسی قانون یا رائے عامہ کی پابند نہیں ہوتی یا ایک حد تک پابند تو ہوتی ہے مگر اختیار رکھتی ہے کہ جب چاہے اس پابندی کو دور کردے۔جس طرح مطلق العنان بادشاہوں کی حکومتیں مستبد ہوتی ہیں اسی طرح ان ''بادشاہوں'' کی حکومتیں بھی مستبد ہوسکتی ہیں جن کے ہاں مجلس مشاورت تو موجود ہو مگر وہ خود جواب دہی سے آزاد ہوں۔ اسی طرح وہ حکومتیں بھی مستبد ہوسکتی ہیں جو نمائندہ یا غیر نمائندہ جماعتوں کے ہاتھ میں ہوتی ہیں کیونکہ مشاورت میں چند افراد

کی شمولیت استبداد کا سد باب نہیں کر سکتی بلکہ بعض اوقات اس قسم کی حکومتیں شخصی حکومتوں سے بھی زیادہ جابر اور مضر ہوتی ہیں' پاکستان کی سابقہ تاریخ آپ کے سامنے ہے۔ نیز وہ حکومتیں بھی مستبد ہو سکتی ہیں جو عوام کی نمائندہ تو ہوں لیکن ان میں تنفیذی قوتیں قانونی قوتوں کے سامنے جواب دہ نہ ہوں اور جس میں عوام' حکمرانوں کا محاسبہ کرنے کا حق نہ رکھتے ہوں۔ غرضیکہ کوئی حکومت استبداد سے مبرا نہیں ہو سکتی۔ جب تک اقتدار قانون کا نہ ہو اور وہ قانون بھی خالصۃً انسانی ذہن کی پیداوار نہ ہو۔ نیز جب تک حکومت قوم کے سخت گیر محاسبہ کے تحت نہ ہو۔ کیونکہ ایسا ہو سکتا ہے کہ عادل سے عادل حکومتی شعبہ بھی قوم کی غفلت یا اپنی طاقت کی وجہ سے استبداد پر تل جائے۔ مفکرین کا فیصلہ اور تاریخ کی شہادت ہے کہ مستبد حاکم حق کا دشمن' آزادی کا بیری اور بیک وقت دونوں کا قاتل ہوتا ہے۔ مستبد حاکم بھی بالآخر ایک انسان ہوتا ہے جو خیر و شر قبول کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے لیکن استبداد پر فریفتہ اس لئے ہوتا ہے کہ اس کا موقع پاتا ہے۔ مستبد کی خواہش ہوتی ہے کہ اس کی رعایا گائے کی طرح مطیع اور دودھ دینے والی رہے اور یا پھر کتوں کی طرح ذلیل چھچھوری اور خوشامدی رہے لیکن اگر رعایا اصیل گھوڑے کی طرح خوددار اور شریف طبع ہو جو سواری دیتا ہے لیکن اگر اس کی توہین کی جائے تو سوار کو پیٹھ سے اٹھا پھینکتا ہے تو مستبد کا استبداد زیادہ دیر تک باقی نہیں رہ سکتا۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

غلام باری، مانچسٹر

خدا کی نُصرت وتائید

نصرت کے معنی اس قسم کی مدد کرنا ہوتے ہیں جس طرح بارش، پیداوار کے لئے زمین کی مدد کرتی ہے۔ اس لئے بارش یا دور دراز سے آنے والے پانی کو نصرت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ قرآن کریم نے کامیابی کے لئے فلاح کا لفظ استعمال کیا ہے جس کے معنی کھیتی کے پروان چڑھنے کے ہیں۔ کھیتی کے پروان چڑھنے کے لئے بارش (پانی) کی ضرورت ہوتی ہے۔ لیکن بارش سے بھی اسی کسان کی کھیتی پروان چڑھتی ہے جو قانون خداوندی کے مطابق زمین تیار کرے اور فصل کی پیدائش کے لئے محنت اور کوشش کرے لہٰذا ہر وہ محنت جو قانونِ خداوندی کے مطابق ہوگی، اس میں خدا کی نصرت شامل ہوگی۔ مثال کے طور پر ایک شخص دریا میں پانی کے بہاؤ کی طرف کشتی چلاتا ہے تو اس میں کم محنت سے کشتی کی رفتار تیز ہوگی۔ دوسرا شخص پانی کے بہاؤ کے خلاف کشتی چلاتا ہے اس میں اسے زور بھی زیادہ لگانا پڑے گا اور کشتی کی رفتار (اس کے باوجود) کم رہے گی پہلے شخص کے ساتھ ''خدا کی نصرت'' شامل تھی۔ دوسرا اس سے محروم تھا۔

جس قوم کو خدا کی نصرت حاصل ہو، جس قوم کی خدا مدد کرے اس قوم پر کسی دوسری قوم کے غالب آنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا یہ خدا کا فرمان ہے کہ ان ینصرکم اللہ فلا غالب لکم (۳/۱۵۹) اور خدا نے مومنین کی مدد کرنا اپنے اوپر فرض کر رکھی ہے۔ وکان حقا علینا نصر المومنین (۳۰/۴۷)۔ آج ساری دنیا کی مسلم قوم مغلوب ہے۔ اس سے ہمیں سمجھ لینا چاہئے کہ ہم مومن ہیں یا نہیں۔

تائید کے معنی ہیں کسی کو تقویت دینا، سامانِ قوت بہم پہنچانا۔ قوانینِ خداوندی کے مطابق سعی وعمل سے جو قوت حاصل ہوتی ہے اسے تائیدِ خداوندی کہا جاتا ہے۔ اس سے انسان کی قوتوں میں اضافہ ہو جاتا ہے اور وہ بہترین نتائج پیدا کرتی ہیں۔

سورہ حج میں ہے کہ و لینصرن اللہ من ینصرہ ان اللہ لقوی عزیز (۲۲/۴۰)۔ جو خدا کی مدد کرتا ہے خدا اس کی مدد کرتا ہے' یہ حقیقت ہے کہ خدا بڑی قوتوں کا مالک اور سب پر غالب ہے......۔ خدا کی مدد کیسے؟ خدا نے ہر ذی حیات کے رزق کی ذمہ داری لے رکھی ہے۔ انسانی دنیا میں خدا کی ذمہ داریاں انسانوں کے ہاتھوں پوری ہوتی ہیں اس لئے انسانوں کو چاہئے کہ یہ ایسا نظام قائم کریں جس میں ہر کسی کو رزق ملے۔ کوئی بھوکا نہ رہے یہ خدا کی مدد کرنا ہوگا۔ دوسرے مقام پر ہے کہ یاایھا الذین امنوا کونوا انصار اللہ (۶۱/۱۴)۔ اے مسلمانو خدا کے مددگار بن جاؤ۔ خدا کی مشیت یا منشاء نظامِ صلوٰۃ (قرآنی نظام۔ دین) قائم کرنا ہے جسے دے کر خدا نے اپنے رسولؐ کو بھیجا۔ اس سلسلہ میں خدا کا حکم ہے کہ وجاھدوا فی اللہ حق جہادہ (۲۲/۷۸)۔ نظامِ خداوندی کے قیام و بقا کے لئے مسلسل جدوجہد کرتے رہو جیسا کہ جدوجہد کرنے کا حق ہے۔ لہٰذا خدا کے قانون کے مطابق قرآنی نظام کے قیام و استحکام کے لئے مال و جان سے جدوجہد کرنا خدا کی مدد کرنا ہے۔ نماز روزہ فرض بجا اور درست لیکن ہماری رسمی نمازوں اور روزوں سے خدا کی کیا مدد ہوگی؟

قرآن کریم کی رو سے خدا کے قوانین دو قسم کے ہیں۔ ایک طبعی قوانین (آیات) جو کائنات میں پھیلے ہوئے ہیں انہیں قوانینِ فطرت (Laws of Nature) کہا جاتا ہے۔ دوسرے اخلاقی قوانین (آیات) جو وحی کے ذریعے انبیائے کرام کی وساطت سے انسانوں کی راہنمائی کے لئے نازل کئے گئے انہیں مستقل اقدارِ خداوندی (Permanent Value) کہا جاتا ہے۔

جو قوم اپنے معاملات میں ان دونوں قوانین کی متابعت کرتی ہے اس کی کوششوں کے نتائج محیر العقول ہوتے ہیں۔ اس سے انسان کی مضمر قوتیں اس انداز سے بیدار اور مشہود ہوجاتی ہیں کہ اور تو اور' وہ خود بھی شعوری طور پر ان کا اندازہ نہیں کر سکتا۔ اسی کو عام اصطلاح میں ''تائیدِ غیبی'' کہا جاتا ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ خدا کی اس تائید و نصرت کے ذرائع و مظاہر خود انسان کے دست و بازو ہوتے ہیں۔ کوئی فوق الفطرت قوتیں نہیں ہوتیں۔ طبعی قوانین کے اتباع سے ان ''ملائکہ'' (Physical Forces) کی تائید حاصل ہوگی جو فطرت کی قوتوں کے انداز میں کام کرتے ہیں اور اخلاقی قوانین کے اتباع سے ان ''ملائکہ'' کی تائید جو خود انسان کے اندر کارفرما ہیں۔ قرآن نے جہاں انسانی زندگی کے متعلق قوانین کو کتاب اللہ سے تعبیر کیا ہے وہاں اس نے قوانینِ فطرت کو بھی کتاب اللہ کہا ہے (۹/۳۶)۔ اور یہ دونوں قوانین خدا کی طرف سے عطا

کردہ ہیں۔ لہٰذا ان دونوں کی پابندی ضروری ہے۔ قوانینِ فطرت کی پابندی سے فطرت کی قوتیں مسخر کی جاتی ہیں اور ان کا استعمال وحیِ خداوندی کی روشنی میں عالمگیر انسانیت کی ربوبیت عامہ (فلاح و بہبود) کے لئے ہونا چاہئے۔ اگر ان میں سے کسی ایک ضابطہ قوانین سے اعراض برتا جائے تو زندگی کا اعتدال و توازن قائم نہیں رہتا اور کاروانِ انسانیت منزلِ مقصود کو نہیں پہنچ سکتا۔ اگر قوانینِ فطرت سے اعراض برتا جائے تو دین مذہب میں تبدیل ہو کر دنیاوی زندگی میں ذلت و خواری کا موجب بن جاتا ہے (مسلمانوں کی حالت) اور اگر مستقل اقدارِ خداوندی سے اعراض برتا جائے، تو دنیا اس جہنم میں گرفتار ہو جاتی ہے جس کی آگ آج اقوامِ عالم کو اپنی لپیٹ میں لئے ہوئے ہے۔ تاریخِ انسانیت اس حقیقت پر شاہد ہے کہ تسخیرِ فطرت اور مستقل اقدارِ خداوندی کو جب بھی الگ الگ رکھا گیا، اس کا نتیجہ تباہی اور بربادی کے سوا کچھ نہ نکلا۔

سورۃ البقرۃ میں ہے کہ افتؤمنون ببعض الکتب و تکفرون ببعض فما جزاء من یفعل ذلک منکم الا خزی فی الحیوٰۃ الدنیا و یوم القیمۃ یردون الی اشد العذاب (۲/۸۵)۔ کیا تم لوگ ایسے ہو کہ تم کتاب کے ایک حصے پر ایمان لاتے ہو اور دوسرے حصے سے کفر برتتے ہو، تو یاد رکھو جو ایسا کرے گا اس کا نتیجہ اس کے سوا کچھ نہیں ہوگا کہ دنیا کی زندگی میں ذلت و خواری اس کے حصے میں آئے گی اور قیامت میں وہ شدید ترین عذاب میں مبتلا ہوگا۔ یعنی قوانینِ فطرت اور مستقل اقدار میں بیگانگی پیدا کرنے کا نتیجہ یہ ہوگا۔

دوسرا گوشہ یہ ہے کہ خود قرآن کریم کے ایک حصے پر عمل کرنا اور بعض سے اعراض برتنا بلکہ بعض آیات پر عمل کرنا اور اسی قانون یا حکم کے متعلق بعض آیات سے اعراض برتنا۔ اس کا نتیجہ بھی ذلت و رسوائی کے سوا کچھ اور نہیں ہوتا۔ ہم نے صدیوں سے یہی روش اختیار کر رکھی ہے اور اس کا خمیازہ بھگت رہے ہیں۔ مثال کے طور پر قرآن کریم کی جن آیات میں صلوٰۃ کے لفظ سے مفہوم نماز پڑھنا لیا جاتا ہے ان پر تو ہم تھوڑا بہت عمل پیرا ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ اس کام کا نتیجہ تو قرآن کے مطابق نہیں نکل رہا۔ دوسری وہ آیات ہیں جن میں لفظ صلوٰۃ کا مطلب نظامِ الصلوٰۃ (قرآنی نظام۔ دین) قائم کرنا ہے ان سے ہم رسولؐ کے آخری خلیفہ حضرت علیؓ کے بعد سے آج تک اعراض برتتے چلے آ رہے ہیں جس کا نتیجہ **خزی فی الحیوٰۃ الدنیا** ہماری ذلت و رسوائی ساری دنیا کے سامنے ہے لیکن ہم ہیں کہ اس عذاب کو محسوس نہیں کرتے کیونکہ ہماری حِس ہی مر چکی ہے۔ سورہ مریم میں انبیائے

کرامؑ کے متعلق ہے کہ یہ وہ لوگ تھے جنہیں اللہ نے اپنی نعمتوں سے نوازا تھا۔ اس کے بعد ہے کہ فخلف من بعدھم خلف اضاعوا الصلوٰۃ و اتبعوا الشھوت فسوف یلقون غیا o (القرآن 19/59)۔ ان کے بعدؑ ایسے ناخلف ان کے جانشین ہوئے کہ انہوں نے نظامِ الصلوٰۃ کو ضائع کر دیا یعنی (قوانینِ خداوندی کے اتباع کے بجائے) اپنے اپنے مفاد اور خواہشات کے پیچھے لگ گئے اور جلد ہی (سرمایہ دار۔ حکمران اور مذہبی پیشواؤں کے ہاتھوں) فریب میں آ کر دھوکا کھا گئے۔ بھٹک گئے۔ گمراہ ہو گئے فسوف یلقون غیا۔ یہی کچھ مسلمانوں کے ساتھ ہو چکا ہے۔ انہیں بصیرت سے کام لے کر مظاہرِ فطرت یا تاریخی شواہد کے مطالعہ سے زندگی کی غرض و غایت اور قوانینِ خداوندی کے مقصود و مطلوب تک پہنچنا ہوگا۔ پھر خدا کی نصرت ان کے شاملِ حال ہوگی۔

فاعتبروا یا اولی الابصار (59/2)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

جمیل احمد عدیل

نتائج کی مُحکمیت پر اعتبار ہی اصلِ ایمان ہے

لازوال شہرت کے مالک روسی نابغہ لیوٹالسٹائی نے ذاتی حوالے سے کہیں بڑی عجیب بات لکھی ہے:

''جب کبھی میں نے اپنی حقیقی خواہشات کو عملی جامہ پہنانے کی کوشش کی یعنی اچھے اخلاق اور اچھی اقدار کا مظاہرہ کیا تو مجھے ذلت و رسوائی اور لعن طعن کے سوا کچھ نہیں ملا اور جیسے ہی میں نے خود کو سطحی خواہشات کے زیر اثر کر لیا ہر طرف سے تعریف اور حوصلہ افزائی ہوئی۔''

صاحبو! بعض مسائل آفاقی ہیں۔ صدیوں سے اہل دانش مسلسل تفکر و تدبر کرتے آ رہے ہیں لیکن ان کا کوئی پائیدار اور مُسکِتْ حل وہ پیش نہیں کر سکے۔ حتیٰ کہ بعضوں کو اپنی عجز کا یوں برملا اعتراف کرنا پڑا: ؎

فکرِ دنیا میں سر کھپاتا ہوں
میں کہاں اور یہ وبال کہاں

غالباً سب سے بڑا مسئلہ' مسئلے کی تعریف ہے۔ سوچنے والی بات ہے' مسئلہ کیا ہوتا ہے؟ یا بنایا جاتا ہے؟ اور سادہ لفظوں میں: ایک فرد کسی ''مسئلے'' کو مسئلہ تسلیم ہی نہیں کرتا' اس کے حل کے ساتھ بھلا اسے کیا دلچسپی ہو سکتی ہے؟ مثال کے طور پر افریقہ کے کسی دور دراز قبیلے کے غیر مہذب شخص سے آپ جا کر پوچھیں:

کیا عالَم ظلِ ہے؟ اور یہ ظل موجود فی الخارج ہے یا موہوم فی الذہن؟

ممکن ہے یہ جناتی سوال سن کر بھوک نہ ہونے کے باوجود وہ مسئول الیہ آدم خوری کا فوری فیصلہ کر لے۔۔۔ مطلب بڑا واضح ہے کہ محولہ سوال اور اس کا کوئی بھی جواب سرے سے اس کا مسئلہ ہی نہیں ہے۔ اس لئے اسے اس جھنجٹ میں پڑنے کی ضرورت ہی کیا ہے؟ لیکن ایسا بھی تو ہو سکتا ہے کہ ہندوستان کے دو علماء و ران کے تلامذہ اس اِشو پر نصف صدی تلک برابر زبانی وتحریری مناظرہ کرتے رہے ہوں۔ اس بنا پر فریقین نے کفر کے فتوے جاری کئے ہوں۔ دونوں گروہ اس اختلاف کو بنیاد بنا کر مرنے مارنے پر تل گئے ہوں۔

گویا اصل شے اِشوز ہیں۔ نان اِیشوز نہیں ہیں اور اِشوز وہ ہوتے ہیں جن کا ہر انسان سے کسی نہ کسی طرح واسطہ ہوتا ہے۔ جو ہندو دھرم کے کسی اوتار کو ہی نہیں مانتا اسے اس بحث سے کیا سروکار کہ وہ آسمانوں پر تشریف لے گئے ہیں یا زمین میں دفن ہیں؟ لیکن یہ نہیں ہوسکتا کہ زندگی کے ارضی حقائق اور ٹھوس صداقتوں سے وہ منہ پھیر کر جی سکے۔ یہاں کوئی کبوتر آنکھیں ''میچ'' بھی لے تو سچائی کی بلی ٹل نہیں جاتی۔ وہ سر پر موجود رہتی ہے۔

لیوٹالسٹائی نے جس نکتے کو پیش کیا ہے وہ زیست کے ساتھ براہِ راست جڑا ہوا ایک قضیہ ہے۔ دنیا کے ہر فرد کا ازل سے مسئلہ۔ اسی لئے بڑے بڑے دماغ متواتر غور و فکر کرتے رہے مگر انہیں اس کا کوئی اطمینان بخش حل سجھائی نہیں دیا۔ اگر ہمارے دانشور دوست ناراض نہ ہو جائیں تو ہم بلا توقف یہ کہہ ڈالیں گے کہ ان سطور میں مستور مسئلے کا حل پیش کرنا عقل انسانی کے بس میں ہی نہیں ہے۔ اس مقام پر انسان کی فہم اپنے پروں کے جلنے کی بُو واضح طور پر محسوس کرنے لگتی ہے۔

کم از کم اس عاجز کی حد تک یہ دلیل بڑی ہی موثر ثابت ہوئی ہے کہ خدا یقیناً کہیں موجود ہے کہ وہ ایسے سوالوں کے جواب فراہم کر دیتا ہے جن کے حوالے سے گوتم بدھ سے لے کر سقراط تک اور سقراط سے لے کر لیوٹالسٹائی تک اور لیوٹالسٹائی سے لے کر گرور جنیش تک سب کے سب گنگ ہیں۔ ان مدمغین کا المیہ یہ ہے کہ یہ جس قدر صراحتیں کرتے جاتے ہیں مسئلہ اتنا ہی الجھتا چلا جاتا ہے۔ المیہ تو ہمارے اپنے خدا پرستوں کا بھی کچھ کم نہیں ہے کہ اللہ کی آخری کتاب موجود ہونے کے باوجود درست سمت میں وضاحت نہ کر سکے۔ لیکن خیر ان کے پاس اس ادھورے پن کا بڑا شافی حل موجود ہے کہ سائل کے جس سوال کا جواب معلوم نہ ہو، اس موقع پر اسے گستاخ، منکر اور مردود وغیرہ قرار دے کر لٹھ اس کے سر پر دے مارو اور ساتھ یہ کہو:

اب بولو! اسی کافر سرسے یہ گمراہ کن اور بے ہودہ سوال اٹھا تھا؟ گویا جس ''خودسر'' نے سوال اٹھایا اسے اسی طرح بٹھا کے چھوڑا۔ ہم نے تو بارہا اپنے اکابر کو مشورہ دیا ہے کہ آپ اپنے موقف کو دلائل سے ثابت کرنے کے بکھیڑے میں ہی نہ پڑا کریں کیونکہ دلائل و براہین کے اپنے چند داخلی تقاضے ہیں۔ دلیل کا بنیادی مطالبہ ہی یہ ہے کہ اس نظریے کے سلسلے میں آخری سوال تک کا دلیل ہی سے جواب مہیا کیا جائے۔ جب دو چار قدم کے بعد سانس پھول جاتا ہے اور مخاطب کو ''قدرت و کرامت'' سے خوفزدہ کر کے خاموش ہونے پر مجبور کرنا ہے تو یہ مجرب نسخہ ابتدا ہی میں کیوں نہ آزما لیا جائے؟ ساری مشکلات شروعات میں ہی آسانی میں تبدیل ہو جائیں گی۔

اب آیئے مرحوم ٹالسٹائی کی طرف۔ موصوف بلاشبہ ایک جینئس تھے۔ اپنے ناولوں اور دیگر تحریروں میں

انہوں نے جس بلندی سے گفتگو کی ہے وہاں تک بہت کم ادباء کو رسائی حاصل ہوسکی ہے۔ ہم ذاتی حیثیت میں ٹالسٹائی کے بے حد مداح اور معترف ہیں لیکن ایک کسک سی محسوس کرتے ہیں: ؎

اگر ہوتا وہ مجذوب فرنگی اس زمانے میں
تو اقبالؔ اس کو سمجھاتا مقامِ کبریا کیا ہے

علامہ اقبالؒ نے تو یہ شعر نیٹشے کو مخاطب کر کے کہا تھا۔ ہم ایسے بے مایہ اقبالؒ اور پرویزؒ کے خوشہ چین اگر قرآن کی صحیح تعلیم ٹالسٹائی تک بس پہنچا ہی دیتے تو وہ دانائے راز اپنے آپ اصل حقیقت تک پہنچ جاتا۔ یقین کیجئے ہم ایسا شوقِ تبلیغ کے وفور میں نہیں کہہ رہے ہیں۔ ٹالسٹائی کو مسلمان کر کے جنت رسید کرنے کی ہمیں چنداں آرزو نہیں ہے بلکہ ہم تو اس بے وقت کی تمنا کے محور میں گم ہیں کہ وہ ایسا عالی دماغ تھا جو بات کو سمجھ سکتا تھا۔ وہ ہمارے لاکھوں مدرسوں اور معلموں سے لاکھ درجہ بہتر تھا کہ انہیں تو سمجھاتے سمجھاتے مخلص تھک گئے ہیں۔ پر سب ایک دم بے سود لطیفہ ہی سہی:

کہتے ہیں بھارت کے سکھ صدر گیانی ذیل سنگھ کو انگریزی نہیں آتی تھی۔ جس کی وجہ سے وزیراعظم اندرا گاندھی بڑی پریشان رہتی تھیں۔ امورِ مملکت اس بنیادی مسئلے کے سبب سخت متاثر ہورہے تھے۔ آخر تنگ آ کر اندرا گاندھی نے اپنے سکھ صدر کو امریکہ بھیج دیا اور فون پر امریکی صدر رونالڈ ریگن سے درخواست کی کہ انہیں آپ اپنے پاس رکھئے۔ جب یہ فر فر انگریزی بولنے لگیں تو واپس بھیج دیجئے۔ ریگن نے ذیل سنگھ کو اپنی خاص صحبت میں رکھا۔ ہر فنکشن پارٹی' ڈنر' کلب' میٹنگ' دورہ' جلسہ' انٹرویو۔۔۔ غرض ہر جگہ ذیل سنگھ ان کے ساتھ۔

ایک سال بعد ریگن نے اندرا گاندھی کو فون کر کے کہا:

''بہن جی! اپنا صدر واپس لے جاؤ۔ میں ہر کوشش کر کے ویکھ لئی اے۔ اینوں انگریزی نہیں آئی' مینوں پنجابی بولنی آ گئی اے۔''

ٹالسٹائی نے یقیناً بڑے کرب کے ساتھ یہ بات اپنی ڈائری میں لکھی ہے کہ جب میں نے اعلیٰ اخلاق اور بڑی اقدار کا مظاہرہ کیا تو خواری مقدر بنی اور جب سطحیت کو شعار بنایا تو داد و تحسین کے ڈونگرے برسائے گئے۔ دوستو! جب اعلیٰ قدروں کے مظاہرے پر رسوائیاں حصے میں آئیں تو فرد پر کیا گذرتی ہے؟ یہ کچھ وہی ستم رسیدہ ہی جانتا ہے۔ سب کچھ آناً فاناً ٹوٹ پھوٹ جاتا ہے۔ وجود کا گلاب پتی پتی ہو کر بکھر جاتا ہے۔ پھر ان نازک پتیوں پر جب کرخت دماغ راہی بھاری بوٹوں کے تلوے رگڑتے ہوئے گزرتے ہیں تو اس پامالی پر تڑپ عذاب بن کر نازل ہوتی ہے۔ سرِدست ہم تسلیم کرلیتے ہیں کہ

حقیقی خواہشات

اعلیٰ اخلاق اور

بلند اقدار

ٹالسٹائی کے تناظر میں ممکن ہے اضافی ہوں۔ یعنی ہوسکتا ہے جنہیں وہ اونچا اخلاق اور روشن اقدار قرار دے رہا ہے۔ ہماری نظر میں ایسا نہ ہو۔ لیکن اس سے کوئی زیادہ فرق نہیں پڑتا۔ آپ تھوڑی دیر کے لئے ٹالسٹائی کی جگہ خود کو رکھ کر دیکھ لیجئے۔ حقیقی خواہشات آپ کی اپنی ہوں، اعلیٰ اخلاق بھی آپ کے اپنے ہوں، بلند اقدار بھی آپ کی اپنی ہوں۔ جی ہاں! آپ کی سوسائٹی کی نہیں بلکہ ''الہامی''۔ ''آسمانی''۔ یعنی جنہیں آپ الہامی اور آسمانی سمجھتے ہیں۔

اب ان ساوی معیارات کے مطابق جب آپ کوئی قدم اٹھائیں تو شش جہات سے نیزوں ایسی زبانیں آپ کا تعاقب کریں۔ آپ کے ایک ایک سانس میں زہر گھول کے رکھ دیا جائے۔ آپ کی زیست مسموم کانٹوں کا پیرہن بنادی جائے تو آپ کیسا محسوس کریں گے؟ اس کے برعکس جب آپ مروج سطحیت کی تقلید کے رویے کو اپنالیں تو آپ کو سر آنکھوں پر بٹھالیا جائے۔ حیات کی ہر نعمت، جہان کی ہر آسائش آپ کے وجود کو قبلہ قرار دے کر اس کے طواف کو اپنے لیے شرف یقین کرے تو آپ کے تاثرات کیا ہوں گے؟

کیا آپ کا وجود دو حصوں میں تقسیم ہو کر نہیں رہ جائے گا؟ اس انقسام کے عذاب کو جھیلنے کے لیے شکتی کہاں سے کشید کریں گے؟ کس طرف جھکیں گے؟ اعلیٰ قدروں کو اپنا کر عمر بھر کے لئے ملامتوں اور طعنوں کا مرکز بننا پسند کریں گے؟ یا پستی کو اپنا کر اونچے سنگھاسن پر فروکش ہونے کو ترجیح دیں گے؟

یہاں آپ کو دو ایک لمحوں کے لیئے لازماً رکنا ہو گا۔ دیکھئے قصہ یہ ہے کہ اگر تو قدریں اضافی ہیں۔ پھر آپ ہمیں بتایئے کہ آخر مروج قدروں کو اپنانے میں کیا مضائقہ ہے؟ جب سماج آپ کو بے پناہ عزت دے، بے طرح مالی منفعت آپ کا نصیب بنے۔ اونچے سے اونچا عہدہ آپ کا مشتاق ہو۔ آپ قبیلے کی آنکھ کا تارا ہوں۔۔۔ تو بھلے وہ قدریں سطحی، وہ اخلاق مبتذل، وہ آرزوئیں ادنیٰ ہوں، انہیں قبول کر لینے میں کیا حرج ہے؟

کیا کہا ضمیر مانع ہے؟ جی ہاں جناب! یہ ضمیر صاحب بہت ستاتے ہیں لیکن آپ نے کبھی سوچا کہ یہ ضمیر کیا چیز ہے؟ جسے اقبال Internalized Society کہتا ہے۔ اس موصوف کی تشکیل کیسے ہوتی ہے؟ کیا یہ ہماری داخلیت میں از خود جاری وساری ہوتا ہے؟ یا ہمارا سماج ہی اس ''بطون'' کا خالق ہے؟ بے شک ایک نقطہ نظر یہ بھی ہے کہ Good اور Evil کا فیصلہ ہمارا ''خداداد'' باطنی نظام کرتا ہے اور دنیا کے ہر فرد کا باطن خیر کو خیر اور شر کو شر۔ یقین کرتا ہے۔ ہمیں اس نظریے کے سلسلے میں بعض تاملات اور

تحفظات مدت مدید سے گھیرے ہوئے ہیں۔ ہمارے مشاہدے نے کبھی شہادت نہیں دی کہ پوری دنیا اچھائی اور برائی کی تعریف پر اپنے ''ضمائر'' کے نور میں متفق ہوگئی ہو۔ نہیں ایسا کبھی نہیں ہوا۔ ہر شخص بڑی ہی نیک نیتی اور اخلاص کے ساتھ جسے اپنے ضمیر کی خالص آواز یقین کرتا ہے۔ وہ بھی کہیں نہ کہیں سے مستعار لی گئی ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بعض اوقات لمحۂ موجود کا ضمیر ماضی کے اپنے ہی ضمیر کی نفی کر دیتا ہے۔

اگر ہر فرد نے خداداد سچائی کا ہی اثبات کرنا ہے تو پھر دو آراء نہیں ہوسکتیں کہ خدا کے مقرر کردہ معیارات دو نہیں ہیں۔ وہاں معیار ایک ہی ہے۔ اپنے ضمیر کی آواز کو خدا کی آواز اعتبار کرنے والے فدائی اس حد تک بھی گئے ہیں کہ ہنستے مسکراتے گردن کٹوا لی ہے۔ دوسری طرف اپنے ضمیر کی آواز کو خدا کی آواز یقین کرنے والوں نے کامل شرح صدر کے ساتھ یہ فیصلہ دیا ہے کہ مرنے والے نے دھوکے میں اپنی جان گنوا ڈالی ہے۔

اب فیصلہ کون کرے گا؟ حقیقت میں ٹالسٹائی کے بیان کردہ مسئلے میں یہی نازک سوال ہلکورے لے رہا ہے۔ ضمیر کا کیا ہے؟ وہ تو اپنے ماحولی اثر کے تحت کچھ نہ کچھ فیصلہ دے ہی دے گا۔ کسی رجحان کو اعلیٰ قدر کہہ دے گا۔ کسی رویے کو پست طرزِ احساس نام دے دے گا۔ چونکہ سوسائٹی میں متنوع قدریں رائج ہوتی ہیں لہٰذا ضمیر کشمکش کے تجربے سے آشنا ہو جاتا ہے۔

اس پس منظر میں یہ صورتحال فطرتاً پیدا ہوگی کہ ایمان روکے گا' کفر کھینچے گا۔ کعبہ اور کلیسا میں کھینچا تانی ہوگی' اب ان مخصوص حالات کا باریک بینی سے جائزہ لینے کی ضرورت ہے کہ ضمیر کسے اعلیٰ قدر قرار دیتا ہے اور کسے ادنیٰ قدر سے موسوم کرتا ہے۔

بھارتی اداکار امیتابھ بچن بیماری سے شفا پائے گا تو وہ شکرانے کے طور پر مندر میں گیارہ کروڑ روپے کا چڑھاوا چڑھائے گا۔ کھاریاں کا عبدالکریم اولاد کا طلبگار ہے' اس کے مدعا کا مرکز حرم ہے۔ وہ ہرج مرج کھینچ کھانچ کر بہرحال جا مطاف میں کھڑا ہوگا۔ کہئے ہمیں آپ کو گیارہ کروڑ روپے کی یہ خیرات عبث عمل دکھائی نہیں دیتی؟ پر جب وہ اداکار ایسا نہ کرتا اور اس رقم کو کسی ادنیٰ قدر کے فروغ کے لئے صرف کر دیتا جس پر فیض یاب افراد اسے سر آنکھوں پر بٹھا لیتے تو وہ یہی کہتا نا کہ اب میرا ضمیر مجھے کچوکے لگا رہا ہے۔ دنیا داروں کے ہاں تو میری واہ واہ ہو گئی ہے لیکن میں نے بھگوان کو راضی کرنے کا ایک سنہری موقع گنوا دیا ہے۔

ظاہر ہے مندر کو گیارہ کروڑ روپے ایسی خطیر رقم دینے پر یہاں وہاں کے ''دنیادار'' اس میگا سٹار کو مطعون کر ہی رہے ہیں۔ لیکن اس کا من شانت ہے کہ ایک اعلیٰ قدر کی بقا کے لیے اس نے بہت بڑی قربانی دی ہے۔ بھلے لوگ

اسے کوس رہے ہیں لیکن وہ ایشور کی نظر میں سرخرو ہو گیا ہے۔

جب وہ کسی ''کمزور لمحے'' کی گرفت میں آئے گا تو عین ممکن ہے وہ ان کو سنے والوں کو کوسے کہ یہی پست ذہنیت والے لوگ ہیں جو میری تعریف میں زمین آسمان کے قلابے ملاتے اگر میں ایسے اعلیٰ اخلاق کا مظاہرہ نہ کرتا۔ کیسے سطحی لوگ ہیں۔ انہیں معلوم ہی نہیں ہے کہ اعلیٰ قدریں' عمدہ اخلاق اور بھگوان کا قرب کیا ہوتا ہے؟ وغیرہ وغیرہ؟

کہیئے احباب! الجھ تو نہیں گئے ہیں؟ کسی گتھی کو سلجھانے کے لیے پہلے الجھاوؤں کو بیان کرنا پڑتا ہے۔ ہمارا مسئلہ بھی مذکورہ لوگوں سے کافی حد تک ملتا جلتا ہے۔ اس لیے کہ ہم قرآن سے دور ہیں۔

قرآن مجید نے دنیا کے ہر فرد بشر سے متعلق اس مسئلے کو بار بار بیان کیا ہے۔ جس کی تلخیص یہ ہے کہ:

اعلیٰ قدروں کا تعین صرف اور صرف خدا کا منصب ہے۔ قدروں کے منظر نامے کی تشکیل ذہنِ انسانی کے بس کی بات ہی نہیں۔ البتہ خدا کی مقرر فرمودہ قدروں کو قبول کرنا یا مسترد کر دینا' اس کا ہر انسان کو اختیار دیا گیا ہے۔ لیکن ان اقدار سے وابستہ نتائج کی تبدیلی کا اختیار حضرت انسان کو عطا نہیں کیا گیا۔

اب رہا اس پیچیدہ ترین مسئلے کا حل کہ کیا انسان کا ضمیر یہ فیصلہ کرے گا کہ

کون سی قدر اعلیٰ ہے؟

اور

کون سی قدر ادنیٰ ہے؟

نہیں اس کا فیصلہ ضمیر نہیں نتائج کریں گے۔

حتمی نتائج ہی آخری فیصلہ دیں گے کہ کون سی قدریں اعلیٰ ہیں اور کون سی ادنیٰ۔۔۔ دیکھئے صاحبو! دنیا کے سب سے بڑے جادو یعنی

+ اضافیت +

کا سحر کس طرح تحلیل ہو جاتا ہے۔ آپ کی آنکھوں کے سامنے دیکھتے ہی دیکھتے دھواں ہو جاتا ہے۔ فریب فی الاصل ہمارے ساتھ یہ ہوا ہے کہ غیر قرآنی دانشوروں نے ہمارے اذہان وقلوب میں یہ بات بٹھادی ہوئی ہے کہ

اضافیت سے بڑا سچ کوئی نہیں ہے

یہاں کچھ بھی طے نہیں ہوا ہے۔ بس یہی طے ہوا ہے۔

قرآن کہتا ہے:

نہیں یہاں باطل کچھ بھی نہیں ہے۔ سب حق کے ساتھ پیدا کیا گیا ہے۔ کائناتی قوانین بھی اٹل ہیں۔ سماجی اصول بھی متعین ہیں اور وہ طے شدہ ہیں۔ نیز انہیں طے تم نے نہیں کیا۔ میں نے کیا ہے۔

اب لوگ لگالیں اپنی اضافیت' کرلیں اپنا شوق پورا۔ مآل کار نتائج کی خوشگواری کو ہولناکی میں اور ہولناکی کی

کو خوشگواری میں نہیں بدل سکتے۔ یہ ہے وہ چیلنج جس پر قرآنی تعلیم Base کرتی ہے۔ بتایئے اس چیلنج کو آج تک کس نے توڑا ہے؟ کس کو کامیابی ملی ہے؟ کسی ایک شخص کا نام تو لیجئے جو کامران ٹھہرا ہو؟ جو تعینات کو عدم تعینات میں منقلب کر سکا ہو؟ اتنا بڑا دعویٰ یونہی نہیں کر دیا گیا۔ دکھ کی بات تو یہ ہے کہ ہم نے قرآن کو مہجور بنا دیا اور ذہن کو بھٹکنے کے لئے چھوڑ دیا۔ ہدایت کے نور کو ترک کر کے گمراہی کے اندھیرے کو چن لیا۔ اور یہ سب ''بنامِ خدا'' ہوا۔

کس طرح؟ سنئے! جو نظام خدا نے دیا نہیں تھا' اسے خدا سے منسوب کر دیا۔ ظاہر ہے نتائج کا عمل الٹ پلٹ ہو گیا۔ اب ''مقدس اداروں'' کی بقا کے لئے تاویل کے پھندوں پر مشتمل ایک جال بچھایا گیا جس میں ہم گرفتار ہوتے چلے گئے۔ غور کیجئے جو اصول' ضابطہ' قانون' قدر خدا کی عطا فرمودہ نہ ہو' ہمیں دجل سے یہ باور کرا دیا جائے کہ یہ اس کی طرف سے ہے اور جب نتیجہ برعکس نکلے تو ہم کیا کریں گے؟ تاویل! عجیب و غریب تاویل۔ تاویل در تاویل۔ یہ ہے ہمارا مقدر۔

آیئے اس بنیادی نکتے کو تھامتے ہیں جس نے یہ سارے مسائل پیدا کیے ہیں۔

(۱) کون سا فعل' فعلِ خداوندی ہے؟

(۲) کون سا فعل' فعلِ خداوندی نہیں ہے؟

سب سے بڑا گھپلا یہ ہوا کہ جو فعل خداوندی تھا ہی نہیں اسے فعل خداوندی بنا ڈالا گیا۔ یاد رکھئے! کسی غیر خدا کے فعل کو خدا کا فعل قرار دینا اتنا ہی بڑا جرم ہے جتنا بڑا جرم خدا کے فعل کو غیر خدا کا فعل قرار دینا۔ اگر موخر الذکر شرک ہے تو یقیناً اول الذکر بھی شرک ہے۔ دونوں ایک ایسے مسموم!

یہی وہ شرک ہے جسے ناقابلِ معافی جرم قرار دیا گیا ہے۔ وحدت الوجود والوں نے اس کا حل یہ نکالا کہ 'خدا اور غیر خدا کے بیچ جو ''حجاب'' ہے اسے ہی اٹھا کر ایک کر دیا جائے۔ چنانچہ ''دوئی'' کے جھگڑے مٹا کر ایسی ''توحید' لائی گئی کہ ہر شے ''خدا'' ہو گئی۔

لیکن جو اس ''طریقت'' پر نہیں چلے' کام انہوں نے بھی ''بوجوہ'' یہی کیا۔ کرنے والا کام نہیں کیا گیا کہ

ہر فعل کا فاعل ڈھونڈا جاتا۔

قرآن کے اسلوب کو بھی نہ سمجھا گیا۔ جن اعمال و افعال میں فاعل خدا کا نظام تھا وہاں اسے یعنی خدا کو براہ راست فاعل قرار دے کر صدیوں کے لئے ذہنِ انسانی کو الجھا کر رکھ دیا گیا۔ مثال کے طور پر

خدا نے کہا ہدایت میں دیتا ہوں اور گمراہ بھی میں ہی کرتا ہوں۔ (مفہوم)

اب جب براہِ راست' بلا واسطہ فاعل اس فعل کا خدا ہے تو بتایئے ہم کہاں کھڑے ہوں گے؟ بے شک ہر چیز کا مالک خدا ہے' قادر وہی ہے۔ ایسے میں ہماری کیا پوزیشن

ہو گی؟

اے محمد (ﷺ) جب تم یہ بتاتے ہو کہ اللہ قادرِ مطلق، صاحبِ اختیار اور قاہر و جبار ہے تو پھر کیوں نہیں وہ ہم کو اپنی طاقت کے زور سے اس ہدایت کے راستے پر چلاتا جس پر چلنے کے لیے تم ہمیں کہتے ہو؟ اگر وہ ہمیں وحدانیت کا پیروکار دیکھنا چاہتا ہے تو پھر موحد بنا کر نیکی کے راستے پر چلا دے اور ہمیں بدعقیدہ ہونے سے بچا کر بتوں کی پوجا سے روک دے اسے کسی نے ایسا کرنے سے روک تو نہیں رکھا۔''

(بحوالہ سرورِ دوعالمؐ کی حیاتِ اقدس کے چند نازک لمحات، ص ۴۷)

اب بتایئے! اگر کفار کے اس طنزیہ استفسار کے جواب میں اس مفہوم کی کوئی آیت پڑھ دی جائے کہ

''ان میں سے بہتوں پر خدا کی بات پوری ہو گئی یہ کبھی ایمان نہیں لائیں گے۔ ہم نے ان کی گردنوں میں طوق ڈال رکھے ہیں اور وہ ان کی ٹھوڑیوں تک ہیں جن سے ان کے سر اوپر کے اوپر اٹھے رہ جاتے ہیں اور ہم نے ان کے سامنے بھی روک بنا دی ہے اور ان کے پیچھے بھی۔ اور ان کے اوپر پردہ ڈال دیا ہے۔ سو انہیں کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ لہٰذا ان کے لئے برابر ہے چاہے تو ڈرائے ان کو یا نہ ڈرائے ان کو، یہ کبھی ایمان نہیں لائیں گے۔'' (۱۰۔۷/۳۶)۔

یا

جمعے کے خطبے کا یہ لازمی حصہ سنا دیا جائے۔

''جس شخص کو خدا ہدایت دے اسے کوئی گمراہ نہیں کرسکتا اور جسے خدا گمراہ کردے اسے کوئی ہدایت نہیں دے سکتا۔''

جی کیا ارشاد فرمائیں گے؟ ان افعال کا فاعل کون ہے؟ جب کفار نے بھی یہ تسلیم کر کے کہا تھا کہ اے محمدؐ! چلیئے آپ ﷺ کی بات مان لی کہ خدا اتنا قادر ہے کہ وہ ہدایت دے سکتا ہے تو پھر وہ اپنی قدرت کا مظاہرہ کر کے ہمیں ہدایت دے کیوں نہیں دیتا؟

تو اس کے جواب میں پھر کیا حضور ﷺ نے خدا سے کہہ کر ان کم عقلوں کو زبردستی ہدایت رکوا دی تھی؟ نہیں حضور ﷺ نے ایسا ہرگز نہیں کیا تھا۔

اب ہمیں کہا جاتا ہے کہ

ہادی

بھی خدا ہے

اور

مضل

بھی خدا ہے

یعنی

ہدایت بھی خدا دیتا ہے

گمراہ بھی خدا کرتا ہے

تو پھر ٹھیک ہے اگر اس نے ہمیں ہدایت نہیں دی تو ذمہ دار وہ خود ہوا نہ کہ ہم۔ اگر اس نے ہدایت دے دی ہے تو اس میں ہمارا کیا کمال؟

ایسے میں

کیا جنت؟

اور

کیا جہنم؟

کیسی سزا؟

اور

کیسی جزا؟

اب آخر میں اس تناظر میں دوٹوک انداز میں بتایئے کہ ہمارے افعال کا فاعل کون ہے؟ ہم خود یا خدا؟ اگر خدا ہے تو بصد معذرت وہ تو یہ بھی کہتا ہے:

''تم میں سے جس کا جی چاہے اسے قبول کر لے جس کا جی چاہے اس سے انکار کر دے۔''

(۱۸/۲۹)۔

یعنی جو چاہے ہدایت اختیار کرے، جو چاہے اس ہدایت سے انکار کر ڈالے۔

کیا معاذ اللہ قرآن میں تضاد ہے؟

آگے بڑھیے:

''اور یہ کہ وہی ہنساتا ہے اور وہی رلاتا ہے۔'' (۵۳/۴۳)۔

آگے چل کر اسی سورۃ نجم میں یہ کہا جا رہا ہے۔

''کیا تم اس بات پر تعجب کرتے ہو؟ اور ہنستے ہو روتے نہیں۔'' (۶۰۔۵۹/۵۳)۔

اگر وہی رلاتا ہے اور وہی ہنساتا ہے تو پھر یہ کیوں کہا کہ تم ہنس رہے ہو جبکہ یہ رونے کا مقام ہے؟

نہیں نہیں خدا کی قسم ان آیات میں قطعاً کوئی تضاد نہیں ہے۔ بے شک فاعل صرف اور صرف اللہ کی ذات ہے۔ لیکن وہ پورے کے پورے سسٹم کا فاعل ہے۔ آگے اس نے اپنی مخلوقات کو اختیارات تفویض فرمائے ہیں۔ جو اختیارات عطا ہوئے ہیں۔ ان کے استعمال سے وہ مخلوقات اپنے افعال میں آزاد ہیں۔ لہٰذا ان کے افعال کے فاعل وہ لوگ ہیں۔ اسی لئے تو خدا ان کا احتساب کرے گا۔ اگر خدا فاعل ہے اور کوئی فاعل ہے ہی نہیں تو پھر حساب کتاب کے کیا معانی؟

اب اس نکتے کی تفہیم ناگزیر ہوگئی ہے کہ بھلے ہر فعل کا فاعل خدا خود کو بتائے لیکن اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں کہ خدا ہی فاعل ہے۔ اس کا سادہ مفہوم یہ ہے کہ وہ اس پورے نظام کا خالق اور فاعل ہے۔ آگے چل کر جو افعال اس کی دیگر مخلوقات انسان سمیت انجام دیتے ہیں۔ ان کے فاعلین انہی مخلوقات سے تعلق رکھنے والے لوگ ہیں۔

چاہے خدا ہر فعل کو اپنی طرف ہی کیوں نہ منسوب کرے۔ اور وہ ایسا کرنے میں یوں حق بجانب ہے کہ اس پورے نظام کا خالق وہ ہے۔جس نے شجر اگایا ہے' اسی نے امکان رکھا ہے کہ اس کا پھل کوئی بھی توڑ سکتا ہے۔لیکن جس نے پھل توڑا ہے وہی ذمہ دار ہے نہ کہ شجر اگانے والا۔

تو یہ طے ہو گیا کہ اقدار اضافی نہیں بلکہ مستقل ہیں' نیز مطلق ہیں۔ان کا خالق انسان نہیں خدا ہے۔مگر ان اقدار پر عامل انسان ہے لہٰذا فاعل وہی ہے۔ان قدروں پر عمل کے نتیجے میں جو اثمار سامنے آئیں گے وہ متعین ہیں۔ ان کا تعین انسان نے نہیں خدا نے کیا ہے۔انسان ان نتائج کو بدل نہیں سکتا۔

اب اس سرمدی ضابطے پر جسے یقین کامل ہے وہ خدا کے مقرر فرمودہ اعلیٰ اخلاق اور مستقل اقدار کے مطابق جب عمل کرے گا تو عوام الناس کے ردِعمل کو ردی عمل سمجھتے ہوئے اسے پرِکاہ کے برابر بھی اہمیت نہیں دے گا۔ وہ لوگوں کی جانب سے' ملنے والی رسوائی' نکبت' ذلت' خواری اور لعن طعن پر کبھی رنجیدہ نہیں ہو گا۔

وہ کبھی ایسا طرزِ عمل اختیار نہیں کرے گا کہ ان اعلیٰ قدروں کو ترک کر کے سطحی خواہشات کے حصول کے لئے کم فہموں کی واہ واہ پر مسرور ہونا شروع کر دے۔نہیں وہ اس عامیانہ روش پر کبھی نہیں گامزن ہو گا۔ کیوں؟ اس لئے کہ اس کی نگاہ مآل پر ہو گی وہ نتائج کی حتمیت اور قطعیت کو اپنا قبلہ قرار دے گا۔

یہ ہوتا ہے فرق اللہ کے رسولؐ اور وحی کے نور سے تہی دانشور میں کہ وہ (رسول) وسیع ترین تناظر میں نتائج کی ہمہ گیری کو دیکھتا ہے جبکہ اپنی عقل سے محدود تجزیہ ترتیب دینے والا مفادِ عاجلہ سے مرعوب و متاثر ہو جاتا ہے۔نیز اپنے وقتی جذبات کی غلامی اختیار کر لیتا ہے۔

لیوٹالسٹائی نے بلاشبہ بڑے کرب کے ساتھ یہ بات کہی ہے کہ اچھی قدروں پر عامل ہونے کے نتیجے میں لوگوں نے اسے مطعون کیا ہے۔ذلیل کیا ہے۔نکو بنایا ہے۔ نکو بتایا ہے۔

لیکن آپ اللہ کے نبیﷺ کی شان دیکھئے کہ انہیں تعلیم دی گئی کہ جب خبیث لوگ آپﷺ کا سرِ بازار تمسخر اڑائیں تو اس پر استقامت کو ہاتھ سے جانے نہیں دینا۔ دل چھوٹا نہیں کرنا۔کٹ حجتیوں پر دل برداشتہ نہیں ہونا' بدزبانیوں سے بے نیازی کا طریقہ اختیار کرنا ہے۔حق بات کہنے کی ذمہ داری ہر صورت میں پوری کرنی ہے' کمینے' بداخلاق اور جہالت زدہ اشخاص کے پیچھے پڑنے سے گریز کرنا ہے۔(مفہوم سورۃ اعراف' آیت ۱۹۹)۔

آخر اللہ کے نبیﷺ نے اتنے مضبوط کردار' اس قدر پختہ سیرت' ایسی ہمت' ایسے استقلال کا مثالی مظاہرہ کیسے کر لیا؟

جواب اس کا یہی ہے کہ انہیں اعلیٰ، مستقل، پائیدار اور مطلق اقدار پر یقین محکم تھا۔ نبوی فراست سے وہ نتائج کی محسوس صورتوں کو مکمل طور پر دیکھ رہے تھے۔

اس لیے وہ اپنی اعلیٰ ظرفی، برداشت، صبر، تحمل اور عفو سے ایک آن کو بھی دستبردار نہیں ہوئے۔ غور کیا جائے تو یہ عفو و تحمل اور ان کے مترادفات کیا ہیں؟ یہ بجائے خود اعلیٰ قدریں ہیں۔

عام ذہن واقعی بہت جلد وقتی عزت، لحاتی توقیر پر سو جان سے لہلوٹ ہو جاتا ہے۔ لیکن ایک شاندار ذہن، وحی کے نور سے منور قلب صدیوں آگے جا کر دیکھتا ہے۔ لہٰذا وہ فوری جذبات سے مغلوب نہیں ہوتا اور مستقبل کے عظیم انقلاب پر نگاہ رکھتا ہے۔ جو ہمیشہ آ کر رہتا ہے۔

آخر میں ہمیں ایک نہایت خاص الخاص نکتہ بیان کرنا ہے۔ لیو ٹالسٹائی جیسا غیر معمولی ذہین یہ تو سمجھتا ہی ہوگا کہ جنہیں وہ حقیقی خواہشات، اعلیٰ اخلاق اور اچھی قدریں یقین کر رہا ہے۔ وہ بہرحال اضافی ہیں۔ ان کا انکھوا زیادہ سے زیادہ اس کے اپنے ضمیر سے پھوٹا ہے۔ وہ تو اس حقیقت سے بھی باخبر ہوگا کہ اس کا ضمیر اس کی سماج کی عطا ہے۔ اس کے باوجود وہ ان قدروں کی توہین پر دل برداشتہ ہو گیا اور چیخ اٹھا کہ بڑھیا پن کا مظاہرہ کرتا ہوں تو لعنتیں پڑتی ہیں، گھٹیا پن پر اترتا ہوں تو سر کا تاج بنایا جاتا ہوں۔ یہ کیا رسم ہے؟ یہ کیسا دستور ہے؟ یہ کیا ستم ہے؟ یہ کیسا ظلم ہے؟

ٹالسٹائی ہی نہیں دنیا کا ہر فرد محسوس کرتا ہے کہ عزت میں راحت ہے، ذلت نرا عذاب ہے۔ چنانچہ ہر فرد تکریم کا طلبگار ہے۔ کوئی نہیں چاہتا کہ اسے رسوائی کی اذیت میں سے گزرنا پڑے۔

اس لئے عزت ملنے پر وہ مسرور ہوتا ہے اور ذلیل ہونے پر وہ بلبلاتا ہے۔ لازمی بات ہے وہ عزت اسی کو کہتا ہے جسے اس کی سوسائٹی عزت کہتی ہے، اسی طرح اس کا معاشرہ جسے ذلت کہتا ہے، وہ بھی اسے ہی ذلت کہتا ہے۔

اگر عہدِ رسالتؐ میں سو سرخ اونٹوں کا مالک ہونا عزت کا معیار تھا تو ابولہب نے اس تعلّی کا برملا اظہار کر دیا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ اس کے جواب میں کوئی یہ نہیں کہے گا کہ:

جناب آپ نے یہ کیا فضول معیار بیان کر دیا؟

یہ اس سوسائٹی کا مسلم الثبوت معیار تھا۔ پر اس معیار کو رسولِ کریم ﷺ نے تسلیم نہیں کیا۔ وگرنہ وہ اللہ سے درخواست کر کے دو سو اونٹوں کے مالک بن جاتے۔ ظاہر ہے خود خدا اس معیار کو کب معیار مانتا تھا؟

اب آئیے لمحۂ موجود میں اپنے المیے کی جانب۔ اگر آپ کسی اذیت میں مبتلا ہوتے ہیں اور یہ گمان کرتے ہیں کہ یہ اذیت من جانب اللہ ہے۔ اور اس اذیت کی وجہ سے معاشرے میں آپ استہزاء کا نشانہ بنتے ہیں۔ اگر

بحیثیت قوم ہیں تو دنیا میں بے حیثیت گردانے جاتے ہیں۔ نیز آپ اس خیال میں مست رہتے ہیں کہ خدا نے مجھے ابتلا میں مبتلا کیا ہوا ہے۔ لہٰذا وہی میری مشکل دور کرے گا۔ میں خود کیوں کچھ کروں؟

من حیث القوم ہماری بربادی کی سب سے بڑی وجہ صاحبو! بس یہی ہے۔ ہمیں جو تکلیف پہنچتی ہے ہم اس کے ''فاعل'' خود ہوتے ہیں۔ اس لیے ہمیں خود ہی اسے دور کرنا ہے۔ خدا تو کسی کو بطور سزا بھی مبتلائے ایذا نہیں کرتا۔ اگر وہ اس طرح غیبی طریقے سے مجرموں کو سزائیں دینے لگ جائے تو سارے کے سارے مجرم دس منٹ کے اندر اندر ''بندے دے پتر'' بن جائیں۔

وہ سزا ضرور دیتا ہے لیکن اپنے نظام کے تحت یعنی انسانوں کے ہاتھوں سزا دلواتا ہے۔ ہاں وہ جو قوانینِ خداوندی سے اِعراض برتتے ہیں وہ خود اپنے لیے سزا تجویز ہی نہیں کرتے' لپک کر خود اس سے گلے مل جاتے ہیں۔ کوئی ہاتھ کو جلائے گا تو عدالت آ کر اسے سزا نہیں سنائے گی۔ جلن خود سزا بن جائے گی۔ مگر یہ نہیں ہوگا کہ کوئی کسی کو قتل کر ڈالے فوراً آسمان سے ایک رسی نازل ہو جو قاتل کے گلے میں پھندا بن جائے۔ البتہ اگر کوئی خود کو قتل کرنا چاہے تو بڑی خوشی سے مینار سے کود جائے۔ کوئی فرشتہ پر پھیلا کر اسے اپنی آغوش میں نہیں لے لے گا۔

یہ سب قوانینِ خداوندی ہیں۔ یہ ازل سے یونہی رہے ہیں۔ ابد تک یوں ہی رہیں گے۔ اگر کوئی کسی تکلیف میں گرفتار ہو گیا ہے تو اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں کہ اس کے کسی جرم پر اسے غیبی طریق پر سزا مل رہی ہے۔ کیونکہ ہم دن رات دیکھتے ہیں کہ ہم اکثر کسی دوسرے کی غلطی پر تکلیف میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ اس میں بظاہر ہماری اپنی کوئی خطا نہیں ہوتی۔ اسی طرح ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ متعدد ایسے خطرناک مجرم ہیں جو مجسم جرم ہیں لیکن وہ عمر بھر مسرور اور خوش وخرم رہتے ہیں۔ کوئی ان کا بال تک باکا نہیں کر سکا۔ بہترین صحت کے ساتھ انہوں نے لمبی عمر پائی ہے۔ رائج الوقت عزت کے ساتھ مرے ہیں۔ مروج آبرو اور متداول اعزاز کے ساتھ دفن ہوئے ہیں۔

اصل مسئلہ وہی ہے کہ ہم غیر خدا کے فعل کو فعلِ خداوندی یقین کرنے کے دھوکے سے نکلیں۔ غور کریں کہاں کائناتی قوت کی کارفرمائی ہے؟ کہاں خالص انسانی فعل وقوع پذیر ہوا ہے؟ آخر ہمیں مصیبت ہی کیا پڑی ہوئی ہے کہ ہم غیر خدائی فعل کو خدائی فعل یقین کر لیتے ہیں؟ جان لیجئے! یہ وہ واحد ''کیل'' ہے جس پر پورے کے پورے مذہب کا چاک گھوم رہا ہے۔ یہ مدرسے' یہ معبد' یہ خانقاہیں...... سب پوتر ادارے صرف اس ایک Exploitation پر زندہ ہیں۔

یہ معلوم کرنا کہ کس فعل کا فاعل کون ہے ذرا مشکل

نہیں ہے۔ سانپ نے کاٹا ہے تو مان لیجئے سانپ نے کاٹا ہے۔ یہ تاویل تراشنے کی کیا ضرورت ہے کہ خدا نے سانپ سے ڈسوایا ہے۔ حرج اس میں یہ ہے کہ پھر آپ کو Justify کرنا پڑے گا کہ خدا نے سانپ سے کیوں ڈسوایا ہے؟ اگر وہ شخص مجرم تھا تو چلئے ایک حد تک جواز فراہم ہو جائے گا۔ لیکن مسئلہ وہیں کا وہیں رہے گا۔ اس لئے کہ سو یقینی مجرم پیش کر دیے جائیں گے جن کو کسی سانپ نے نہیں کاٹا اور سوا یسے افراد بھی پیش کر دیے جائیں گے جو بالکل بے تقصیر تھے اور انہیں سانپ کاٹ گیا۔

اگر خدا کا یہی طریقِ انصاف ہوتا تو ہدایت اترتی نہ قانون نازل ہوتا۔ کتاب نہ صاحبِ کتاب، عدالت نہ شہادت کسی شے کی ضرورت نہیں تھی۔

عین ممکن ہے فقیر کو ایک روپیہ خیرات نہ دینے والا سائیکل سے گر جائے اور اس کی ہڈی فریکچر ہو جائے۔ مگر کیا ہے کہ لاکھوں بے گناہوں کا قاتل صدر بش پوری دنیا پر اسی طنطنے سے حکومت کئے جائے گا۔ اس طرح بڑی مشکل پیش آئے گی۔

آئیے ہم سب مل کر فعلِ خداوندی اور انسانی افعال کے درمیان واضح لکیر کھینچیں تا کہ شرک کا دروازہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے بند ہو جائے۔ آئیے انسانوں سے جھوٹے سہارے چھین لیں۔ ہم انہیں بے سہارا نہیں کریں گے۔ انہیں سچا سہارا فراہم کریں گے اور وہ سچا سہارا خدائے وحدہ لاشریک کا سہارا ہے۔ یعنی اس کے اٹل قوانین جو تمام انسانوں کے لیے یکساں ہیں۔ جو ان سے مستفیض ہونا چاہتا ہے، اسے کوئی روک نہیں سکتا اور جو محروم رہنا چاہتا ہے اسے کوئی زبردستی فیضیاب کر نہیں سکتا۔ جب اللہ کے قوانین پر اعتماد پیدا ہو جائے گا تو پھر اعلیٰ و مستقل و مطلق قدروں پر ایسا بھروسہ نصیب ہو جائے گا جو آپ ﷺ کی پیروی میں صحابہؓ کو نصیب ہو گیا تھا۔ پھر ان کا آج ان کے گزشتہ کل سے بہتر تھا اور ان کا آئندہ کل آج سے بہتر ہو گیا تھا۔ زمانہ چاہے کچھ کہے اعلیٰ قدروں کی فعالیت پر بدگمانی کے جرم میں دل آلودہ نہیں ہو گا۔ وقتی واہ واہ اور توقیر و تکریم سے بچوں کی طرح دل آسودہ بھی نہیں ہو گا۔ لیکن ایسا صرف تب ہو گا جب خود کو، پورے کے پورے وجود کو نتائج کی مُحکمیت کے سپرد کر دو گے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

خواجہ ازہر عباس، فاضل درسِ نظامی

دین و مذہب میں قانون سازی کے فاصلے

یہ انسانیت کی بدقسمتی ہے کہ خلافت راشدہ کے بعد اسلام کا حقیقی اور سنہری دور منقرض ہوگیا اور چند وجوہ و اسباب کی بناء پر خلافت ملوکیت میں تبدیل ہوگئی۔ بنوامیہ کا دور ۴۰ھجری سے شروع ہوکر ۱۳۲ ہجری پر ختم ہوا۔ یہ اموی دور ۹۲ سال جاری رہا۔ اگرچہ یہ ملوکیت کا دور تھا لیکن یہ خالص عربی دور تھا۔ بنوامیہ کا تختہ الٹنے کے بعد، بنوعباس برسراقتدار آئے جن کا دور تقریباً چھ سو سال تک جاری رہا۔ اس دور میں ملوکیت ایرانیوں کے زیر اثر رہی۔ ایرانیوں کے اثرات خلافت راشدہ سے ہی شروع ہو گئے تھے۔ خلافت راشدہ میں تین خلفاء کرام کا دارالخلافہ مدینہ شریف رہا لیکن حضرت علی المرتضیٰؓ کے دور میں مرکز خلافت کوفہ تھا بلکہ کوفہ آباد ہی حضرت علی المرتضیٰؓ نے کیا تھا۔ اس زمانہ میں شرق وسطیٰ کا جغرافیہ آج سے بالکل مختلف تھا اور چھوٹی چھوٹی ریاستوں کی یہ صورت نہیں تھی۔ اس وقت ایران کوفہ سے Govern کیا جاتا تھا اور دریائے فرات Boundary Line تھی۔ کوفہ میں ایرانیوں کا اثر زیادہ تھا اور ایرانیوں کے ان اثرات میں روز بروز اضافہ ہوتا چلا گیا۔ چونکہ عباسیوں کو اقتدار ہی ایرانیوں کی وجہ سے ملا تھا، اس لئے ظاہر ہے کہ اس Regime پر ان کا اثر بہت زیادہ تھا خصوصاً برامکہ کے دور میں تو خلفاء نے سارا اقتدار ان کو ہی دیا ہوا تھا۔ خلافت راشدہ کے دور میں فتوحات اس قدر تیزی سے ہوئیں کہ جو آبادیاں بھی اس مملکت میں شامل ہوتی گئیں۔ ان کی صحیح تعلیم و تربیت نہیں ہو سکی۔ اس زمانہ میں رسل و رسائل بھی نہایت مشکل و محدود تھے اور زیادہ تر آبادی بھی غیر تعلیم یافتہ تھی۔ اس لئے، ظاہر ہے، کہ حکومت کی آئیڈیالوجی (اسلام) کی نشر و اشاعت نہیں ہوسکی۔ لیکن اس سب کے باوجود مسلمان جہاں کہیں بھی گئے وہاں کی آبادیوں نے نہ صرف اسلام قبول کر لیا بلکہ عربوں کی معاشرت و زبان بھی اختیار کر لی۔ اس زمانہ میں عربی زبان صرف عربوں (موجودہ سعودی حکومت کا علاقہ) تک محدود تھی لیکن مسلمانوں کی فتوحات کے ساتھ ساتھ عربی زبان مصر، سوڈان، لیبیا وغیرہ سے لے کر مراکش

تک عربوں کے ساتھ ساتھ چلتی چلی گئی اور ہر مفتوح ملک نے اپنی زبان چھوڑ کر عربی زبان اختیار کر لی۔لیکن یہ بات بڑی غور طلب ہے کہ ایرانیوں کی ساتھ صورتِ حال بالکل مختلف رہی حالانکہ وہ بالکل متصل علاقہ میں تھے۔لیکن اس کے باوجود نہ تو انہوں نے عربی زبان کو اختیار کیا اور نہ ہی عربوں کی معاشرت کو کوئی اہمیت دی۔ اگر اس وقت اور دیگر ممالک کی طرح ایرانی بھی عربی زبان اختیار کر لیتے تو آج ہماری مادری زبان بھی عربی ہوتی لیکن ایرانیوں نے عربی زبان اور عربی کلچر دونوں کو نہ صرف مسترد کر دیا بلکہ خود ایرانیوں نے عربی معاشرت کو بے حد متاثر کیا اور اس طرح بیشتر مجوسی نظریات مسلمانوں میں سرایت کر گئے۔

بنوامیہ کے دور میں عربوں/مسلمانوں کے پاس کوئی کتاب نہیں تھی صرف قرآن کریم ان کے پاس تھا۔ اس وقت تک نہ تفاسیر و احادیث کے مجموعے جمع کئے گئے تھے اور نہ قانون سازی شروع ہوئی تھی۔ ہماری بدقسمتی کہ بنو عباس کے دور میں جبکہ ایرانی مجوسی نظریات خوب فروغ پا گئے' اس وقت ہمارے ہاں یہ سب علمی وتحریری کام شروع ہوئے۔ قانون سازی بھی اس دور میں شروع ہوئی۔ ہم مسلمانوں میں قانون سازی اس وقت شروع ہوئی جب دین کا تصور دور دور بھی نہیں تھا۔ملوکیت خوب اپنے پنجے گاڑ چکی تھی۔ خالص مذہب کا دور شروع ہو چکا تھا۔ اس سے ظاہر ہے کہ ہماری یہ ساری قانون سازی' دین وقرآن کے خلاف ہے۔ دین اور مذہب میں قانون کے مصادر و منابع (Sources of Law) ہی مختلف ہوتے ہیں۔ جب ان دونوں میں قانون کے ماخذ ہی مختلف ہیں تو ان دونوں میں قانون ایک جیسا کیسے ہوسکتا ہے۔ جب بنیاد ہی غلط ہے' تو قانون کی ساری عمارت ہی غلط اٹھتی ہے۔ ؎

خشتِ اول چوں نہد معمار کج
تا ثریا می رود دیوار کج

خلافِ قرآن قانون سازی کی دوسری وجہ یہ ہے کہ قانون سازی کے مطامح نگاہ و مقاصد ہی قرآن کے خلاف ہو گئے۔ملوکیت' پیشوائیت قرآن کریم کے خلاف بلکہ قطعاً حرام ہے۔ قرآن کریم کی اس واضح تعلیم کے باوجود' جابر' فاسق' بدچلن' بدکردار' بدعہد' عنید و فاسق بادشاہ محض اپنی تلوار کی دھار کے زور پر مسلمانوں کی گردنوں پر سوار ہو گئے اور اس دور میں جس قدر قوانین بنائے گئے' ان سب کے پیش نظر ملوکیت کو تقویت و استقلال دینا اور بادشاہوں کی بدکرداری کی تصویب کرنا تھا۔ چونکہ ان بادشاہوں کے حرم میں کئی کئی سو کنیزیں' اور کام کرنے کے لئے غلام ہوتے تھے ان قوانین نے قرآن کے واضح حکم کے خلاف کنیزوں اور غلاموں کا جواز فراہم کیا۔ حالانکہ قرآن کا واضح ارشاد ہے۔

اما منا بعد واما فداءً (۴/۴۷)۔

(ان کو) یا تو احسان رکھ کر چھوڑ دو یا فدیہ لے کر۔

قرآنِ کریم نے زمین کی ملکیت' اس کی خرید وفروخت حرام قرار دی لیکن مذہبی قانون نے اس کو بالکل جائز کر دیا۔ یہ سب قوانین ملوکیت کی تائید واستقلال میں اس وجہ سے بننے ممکن ہو سکے کہ ہمارے مقننین وفقہائے کرام نے' قانون سازی کے ماخذ ہی غلط اختیار کر لئے۔ اس مضمون میں مذہب میں قانون سازی کے جو غلط مصادر ومنابع ہیں' ان کی نشاندہی کی گئی ہے۔ ہمارے ہاں ہزار سال سے قانون سازی' یعنی اصول فقہ میں ادلہ اربع کو ماخذات قانون قرار دیا جاتا ہے اور مسلمانوں کے تمام فرقوں میں' ہزار سال سے اس بات پر اتفاق چلا آ رہا ہے لیکن افسوس کہ یہ ادلہ اربعہ ہی قرآن کے خلاف تصور ہے اور ہمارے تمام فرقوں پر ان کا اتفاق ہی قرآن کے خلاف ہے اور ان کا اس پر ایک ہزار سال سے اتفاق ہی اس وجہ سے ہے کہ یہ تمام فرقے مذہب کے دائرہ میں رہتے ہیں۔ دین کا کوئی تصور ان میں سے کسی کے سامنے ہے ہی نہیں۔ مذہب تو سب ہی غلط ہوتے ہیں خواہ وہ کوئی بھی مذہب ہو صحیح اور درست تو صرف دین ہوتا ہے۔

قرآن کریم میں ارشاد ہوتا ہے:

(۱) ومن لم یحکم بما انزل اللہ فاؤلئک هم الکافرون (۵/۴۴)۔

جو ما انزل اللہ کے مطابق فیصلے نہ کرے وہ کافر ہے۔

(۲) ومن لم یحکم بما انزل اللہ فاؤلئک هم الفاسقون۔

جو ما انزل اللہ کے مطابق فیصلے نہ کرے وہ فاسق ہے۔

(۳) من لم یحکم بما انزل اللہ فاؤلئک هم الظالمون۔

جو ما انزل اللہ کے مطابق فیصلے نہ کرے وہ ظالم ہے۔

(۴) اتبعوا ما انزل الیکم من ربکم ولا تتبعوا من دونه اولیاء (۷/۳)۔

جو کچھ تمہارے رب کی طرف سے نازل کیا گیا ہے' اس کا اتباع کرو' اس کے سوا اور کارسازوں کا اتباع نہ کرو۔

(۵) وان احکم بینهم بما انزل اللہ (۵/۴۹)۔

جو احکام خدا نے نازل کئے' ان کے مطابق فیصلے کرو۔

ان پانچ آیات کریمات اور اسی قبیل کی مزید بیشتر آیات میں قرآنِ کریم نے واضح حکم فرمایا ہے کہ جو کچھ اللہ کی طرف سے نازل کردہ ہے' یعنی جو کچھ بھی ''منزل من اللہ'' ہے صرف اور صرف اس کے مطابق فیصلے کرو اور جو کوئی بھی ''منزل من اللہ'' کے مطابق فیصلے نہیں کرتا وہ ظالم'

کافر' فاسق ہے۔''منزل من اللہ'' میں تخفیف و اضافہ کرنے سے کفر و فسق کا ارتکاب ہوتا ہے کیونکہ یہ حکم اس درجہ واضح ہے کہ ہمارے علماء کرام' جو مذہب کے داعی ہیں' اس کے خلاف جا ہی نہیں سکتے تھے اور ان کو ملوکیت کے استقلال و بقاء و تحفظ کے لئے' قانون بنانے کی کوئی راہ نہیں نکلتی تھی' اس لئے انہوں نے یہ ترکیب کی کہ انہوں نے حدیث کو ہی ''منزل من اللہ'' میں شامل کر دیا' اور وحی خفی کا نظریہ کی بنیاد ڈال دی۔ اب ان کے سامنے ہر طرح کا قانون بنانے کے لئے میدان صاف تھا۔ یہ چور دروازہ کھولا ہی اس لئے تھا۔ ہمارے علماء کرام کے نزدیک اقوال رسول یعنی روایات و احادیث وحی ہیں اور اسی وجہ سے وہ حدیث کو قانون کا ماخذ قرار دیتے ہیں۔ لیکن اگر یہ بات ثابت کر دی جائے کہ حدیث وحی نہیں ہے' تو پھر حدیث کو قانون کا ماخذ تسلیم نہیں کیا جا سکتا' پھر تو پاؤں کے نیچے سے زمین ہی سرک جاتی ہے' اگر اس کے باوجود بھی کوئی حدیث کو قانون کا ماخذ تسلیم کرے گا' تو وہ قرآن کی رو سے کافر' فاسق' ظالم ہوگا۔

''وحی صرف قرآن میں ہے'' کے موضوع پر کمترین کے آٹھ مقالے' طلوع اسلام اور دیگر قرآنی جرائد میں طبع ہوئے جو بعد میں ہزاروں کی تعداد میں مفت بھی تقسیم کئے گئے۔ جن حضرات کو اس موضوع سے دلچسپی ہو' وہ ان مضامین میں سے ایک دو ہی مضامین ملاحظہ فرمالیں۔ زیرِ نظر مضمون میں صرف ان مزید تین دلائل کا حوالہ دیا جاتا ہے' جو ان آٹھ مضامین میں تحریر نہیں کئے گئے تھے۔

(۱) سب مومنین کو حکم ہے کہ وہ اپنے کام مشورے سے کریں۔ وامرھم شوریٰ بینھم (۴۲/۳۸)۔ ان کے کام آپس میں مشورے سے ہوتے ہیں۔ لیکن اس پر مستزاد یہ کہ حضورﷺ کو الگ حکم ہوا۔ شاورھم فی الامر (۳/۱۵۹)۔ ان سے امور میں مشورہ کرلیا کرو۔ حضورﷺ کو یہ قرآنی حکم ہے۔ مشورے کی صورت یہ ہوتی ہے کہ کبھی مستشیر کی رائے درست ہوتی ہے اور کبھی مستشار کی۔ جب حضورﷺ مشورہ فرماتے ہوں گے تو کبھی آپﷺ کی بات درست ہوتی ہوگی اور کبھی صحابہ کرام رضی اللہ عنھم کی۔ اگر حضورﷺ کے سارے اقوال وحی تھے تو وحی کی تو یہ صورت نہیں ہوسکتی۔ وحی میں تو ظن و گمان شامل ہی نہیں ہوسکتا۔ وحی کے نزول کے وقت ملائکہ اس کی حفاظت کرتے تھے (۷۲/۲۷)۔ آپ خود اندازہ فرمالیں کہ کیا وحی بھی مشورہ کی طلبگار ہوسکتی ہے۔ بہت واضح بات ہے کہ یا وحی ہوگی یا مشورہ۔ کسی کا مشورہ وحی نہیں ہوسکتا۔ وحی اور مشورہ ایک ساتھ نہیں ہوسکتے۔

(۲) ارشاد ہوتا ہے۔ قل ھذہ سبیلی ادعوالی اللہ علی لبصیرۃ انا ومن اتبعنی (۱۲/۱۰۸)۔ کہہ دو یہ میری راہ ہے میں اللہ کی طرف بلاتا ہوں پوری بصیرت کے ساتھ میں بھی اور وہ لوگ جو میری پیروی کرتے ہیں۔ یعنی جس طرح میں اللہ

کی طرف بلاتا ہوں' اسی طرح میرے پیرو بھی اللہ کی طرف بلاتے ہیں اور ہم سب اس دعوت الی اللہ میں بصیرت و دلائل سے کام لیتے ہیں۔ یہ بصیرت سے کام لینا میرا اور میرے متبعین کا مشترک عمل ہے۔ ظاہر ہے کہ حضورﷺ کی سوچ جو بالکل حضورﷺ کے متبعین کی طرح کام کرتی تھی' وحی کیسے ہوسکتی تھی۔ وحی تو خالصتہً تنزیل من رب العالمین ہوتی تھی۔ اللہ کی طرف سے نازل کردہ' اس میں پوری پوری معروضیت Objectvity ہوتی تھی۔ اس میں نبی کی خواہش یا سوچ کو دخل ہی نہیں ہوتا تھا۔ اس سے ثابت ہے کہ حضورﷺ کے اقوال وحی نہیں تھے۔ اسی طرح دوسری جگہ ارشاد ہے ولو ردوہ الی الرسول والی اولی الامر منھم لعلمہ الذین یستنبطونہ منھم (۴/۸۳)۔ اور اگر یہ ان (افواہوں) کو رسول اور اپنی اولوالامر کے سامنے پیش کر دیتے تو جو لوگ ان میں سے بات کی تہہ تک پہنچنے والے ہیں' وہ اس کو اچھی طرح سمجھ لیتے۔ یہاں پھر فرمایا کہ اگر یہ افواہوں کو رسول اور اولی الامر کے سامنے پیش کر دیتے تو خود رسول اور اولی الامر اس میں غور وخوض کر کے' معاملہ کی تہہ تک پہنچ جاتے۔ یہاں پھر حضورﷺ کو اولی الامر کے ساتھ Bracket کیا گیا ہے کہ استنباط کے عمل میں حضورﷺ دیگر اولی الامر کی طرح تھے۔ اور ظاہر ہے کہ کسی کے بھی استنباط میں وحی کا کوئی دخل نہیں ہوسکتا۔

(۳) ارشاد ہوتا ہے۔ لو تقول علینا بعض الاقاویل۔ لا خذنا منہ بالیمین۔ ثم لقطعنا منہ الوتین (۴۴۔۴۶/۶۹)۔ اور اگر یہ (رسول) ہم پر کوئی بات گھڑ کے لگاتا تو ہم اس کو بائیں بازو سے پکڑتے پھر ہم اس کی شہ رگ ہی کاٹ دیتے۔ تقول علیہ قولاً کے معنے ہیں اپنی طرف سے بات بنا کر دوسرے کی طرف منسوب کرنا۔ آیت کریمہ کا مفاد وفحویٰ یہ ہے کہ اگر حضورﷺ اپنے کسی قول کو' جو خدا نے نہ کہا ہوتا' اسے خدا کا قول بتاتے کہ جو کچھ میں کہہ رہا ہوں وہ خدا کا قول ہے (یعنی وہ وحی خفی ہے) تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ہم اس رسول کو قتل کر دیتے۔ آیہ کریمہ کا اعجاز یہ ہے کہ صرف ایک ہی آیت نے وحی خفی کی جڑ کاٹ دی اور قول خدا اور قول رسولﷺ کو الگ الگ نکھار کے رکھ دیا ہے۔ اس سے واضح ہوگیا کہ رسول اللہ کے اپنے اقوال ہوتے تھے۔ جو خدا کے اقوال نہیں ہوتے تھے۔ لیکن حضورﷺ ان اقوال کو اپنے ہی اقوال بتاتے تھے۔ اللہ کی طرف منسوب نہیں فرماتے تھے۔ وعید وتہدید اس بات پر کی جارہی ہے کہ حضورﷺ اپنے اقوال کو' اقوال خدا کہیں' خود اقوال کے وجود کا انکار نہیں کیا جارہا ہے۔ بلکہ اس کے برخلاف اس کی تثبیت کی جارہی ہے۔

بطور جملہ معترضہ عرض ہے کہ سر محمد ظفر اللہ خاں اپنے ایک مضمون میں اور دیگر احمدی حضرات بھی' اس آیت

سے مرزا غلام احمد کی نبوت کی دلیل لائے ہیں کہ اگر مرزا صاحب جھوٹا دعویٰ کر کے' اللہ تعالیٰ پر افتراء باندھتے تو اللہ تعالیٰ ان کو قتل کر دیتا اور چونکہ اللہ تعالیٰ نے ان کی کوئی گرفت نہیں کی' اس لئے ان کا دعویٰ رسالت درست تھا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس طرح کی کڑی نگرانی' اللہ تعالیٰ صرف ان لوگوں کی کرتا ہے' جن کو وہ منصب رسالت پر مامور فرماتا ہے۔ اس لئے کہ ان کی تحویل وحفاظت میں وحی الٰہی کا خزانہ ہوتا ہے جس کی حفاظت وصانت ضروری ہوتی ہے۔ اس سے یہ بات لازم نہیں آتی کہ جو شخص بھی اللہ تعالیٰ پر جھوٹ باندھے گا' اس کی گردن کاٹ دی جائے گی۔ جھوٹ بولنا تو درکنار' بہت سے لوگ ہیں' جو معاذ اللہ خدا کو گالیاں تک دے دیتے ہیں' لیکن اس دنیا میں ان کا کوئی نقصان نہیں ہوتا۔ اگر مرزا صاحب کی صداقت کی یہ دلیل تسلیم کر لی جائے' تو ان سے بیشتر اور لوگوں نے بھی نبوت کا جھوٹا وعدہ کیا تھا۔ ان کے ہی ہم عصر بہاء اللہ نے نبوت کا دعویٰ ان کے سامنے کیا تھا۔ ان کی صداقت کے لئے بھی اس آیت سے دلیل حاصل کی جا سکتی ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ خدا کا کوئی سچا رسول نہ خدا پر افتراء کر سکتا ہے اور نہ ہی کسی کے دباؤ میں وہ وحی میں کمی بیشی کر سکتا ہے۔ بہرحال یہ ایک جملہ معترضہ تھا۔ اس کا اصل مضمون سے کوئی علاقہ نہیں۔

یہ بات بھی توجہ کی متقاضی ہے کہ ہم جن روایات کو حدیث یا قول رسول اور وحی خفی کہہ کر ان کو منزل من اللہ قرار دے کر' قانون کا ماخذ شمار کرتے ہیں وہ حقیقت میں نہ حدیث ہے اور نہ قولِ رسولؐ۔ یہ تمام احادیث وروایات تو رواۃ کے اپنے الفاظ ہیں ہمارے علمائے کرام کے اپنے نظریہ کے مطابق احادیث باللفظ نقل نہیں ہوئی ہیں بلکہ نقل بالمعنی ہوتی ہیں اور یہی وجہ ہے کہ حدیث کے شروع میں کسی صحابی کی طرف منسوب کر کے کہتے ہیں کہ انہوں نے فرمایا یعنی قال ابوہریرہ' اور آخر میں اوکما قال علیہ السلام یعنی یا جیسے بھی حضور نے فرمایا تحریر کیا جاتا ہے اور یہ درمیان کے الفاظ راوی کے مثلاً حضرت ابوہریرہ کے اپنے ہوتے ہیں۔ غور طلب بات یہ ہے کہ راوی (حضرت ابوہریرہ) کے یہ درمیان کے الفاظ وحی کیسے ہو سکتے ہیں۔ یہ وحی ہو ہی نہیں سکتے' یہ تو رواۃ کے اپنے منہ سے نکلے ہوئے الفاظ ہیں فلہٰذا کبھی بھی قانون کا ماخذ نہیں بن سکتے۔

یہاں تک یہ بات ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے احادیث وروایات 'منزل من اللہ' نہیں ہیں' اور جب وہ ''منزل من اللہ'' نہیں ہیں تو مندرجہ بالا پانچ آیات کریمات (اور مزید متعدد آیات) کے مطابق وہ قانون اسلامی کا ماخذ نہیں بن سکتیں۔ کیونکہ اسلامی قانون کا ماخذ صرف وہ ہے جو 'منزل من اللہ' ہے۔

حدیث کو ماخذ قانون بنانے کی وجہ سے ہمارے فقہاء کرام کے لئے بڑی سہولت ہوگئی اور ایک بڑا وسیع

میدان مل گیا۔ ہمارے ہاں جو خلاف قرآن قوانین چلے آ رہے ہیں‘ مثلاً رجم‘ مرتد کی سزا‘ غلام و لونڈیوں کی اجازت‘ عورتوں پر تشدد کرنا‘ محجوب الارث‘ عول کا مسئلہ نا کتخدا سے دوسری شادی اور اس کے علاوہ دیگر بہت سے قوانین حدیث کی اساس پر ہی بنائے گئے ہیں‘ جو قرآن کریم کے خلاف ہیں۔

یہاں تک آپ نے مذہب میں قانون سازی کے عمل کو ملاحظہ فرمایا ہے۔ اب دین میں قانون سازی کا اصول پیش خدمت عالی کیا جاتا ہے۔

ہمارے اصول فقہ کے مطابق اسلامی قانون کے ماخذ چار ہیں۔ قرآن‘ حدیث‘ اجماع‘ قیاس‘ ان ہی چار مصادر و منابع (Sources) سے اسلامی قانون یعنی فقہ اسلامی مدون کیا گیا ہے۔ جیسا کہ عرض خدمت کیا گیا ہے یہ چاروں مصادر مذہب کی رو سے ہیں۔ دین کی رو سے نہیں۔ دین کی رو سے تو صرف قرآن اسلامی قوانین کا ماخذ ہے اور صرف وہی ''منزل من اللہ'' ہے۔ یہ باقی تین مصادر قانون کے مصادر نہیں ہیں بلکہ قانون بنانے کے ضابطے اور اس کے Procedure ہیں (جس کی تفصیل آگے آتی ہے) ارشاد ہوتا ہے۔ یاایھا الذین امنوا اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول و اولی الامر منکم فان تنازعتم فی شئی فردوہ الی اللہ و رسول () اے ایمان والو! خدا کی اطاعت کرو اور رسول کی۔ اور جو تم میں سے صاحبانِ امر ہیں ان کی اطاعت کرو اور اگر تم کسی بات میں جھگڑا کرو تو اس کو خدا اور رسول کی طرف پلٹا دو۔ اس آیۂ کریمہ میں‘ اللہ و رسول سے مراد ہمارے فقہاء کرام قرآن و حدیث لیتے ہیں۔ اس آیت میں صرف قرآن و حدیث کو حجت قرار دیا گیا ہے‘ اور اس آیت نے قیاس و اجماع کا بالکل پتہ ہی کاٹ دیا۔ اس آیہ کریمہ میں صرف قرآن و حدیث کو حجت قرار دیا گیا ہے اور قیاس و اجماع کو ماخذ قانون میں شامل نہیں کیا گیا ہے۔ مروجہ قانون کے دو مستند ترین مصادر کی تردید تو صرف اسی ایک آیت سے ہو گئی۔ جہاں تک ہمارے علماء اس آیت میں رسول سے مراد حدیث لیتے ہیں‘ اس کے بارے میں صدر مضمون میں بحث کر دی گئی ہے کہ وہ قانون کا ماخذ نہیں بن سکتی۔ اس سابقہ بحث میں یہ بھی اضافہ کیا جاتا ہے کہ قانون کے لئے باللفظ منقول ہونا ضروری ہے اور حدیث چونکہ باللفظ منقول نہیں ہے اس لئے وہ قانون کا ماخذ نہیں بن سکتی۔ اصل یہ ہے کہ وہ قانون کے Criterion پر آتی ہی نہیں۔ دین میں قانون کا ماخذ صرف قرآن کریم ہے اور یہ تین مصادر قانون سازی کے طریقے میں شامل ہوتے ہیں۔ جن کی صورت یہ ہوتی ہے کہ جب بھی اسلامی حکومت قائم ہو‘ وہ سابقہ اسلامی حکومت یا عملی طور پر یہ کہیں کہ حضور ﷺ کی حکومت یا خلافت راشدہ کے فیصلوں کو پیش نگاہ رکھے گی۔ حضور ﷺ کے دور کے اور

خلافت راشدہ کے سابقہ فیصلے' اگر اس موجودہ دور کے مطابق ہوئے اور اس دور میں عملی طور پر نافذ ہو سکے' تو ان کو اختیار کر لیا جائے گا' ورنہ ان کو موجودہ دور کے مطابق بنا کر' ان کا اجراء کیا جائے گا' یہ طریقہ اتباع سنت' کہلائے گا۔ مثلاً قرآن کریم نے مہر کو نکاح کے شرائط میں سے ایک شرط قرار دیا ہے۔ یہ قرآن کا حکم ہے۔ حضور کے دور اور خلافت راشدہ میں اس کی ایک رقم متعین کر دی گئی تھی' جو شاید ہمارے دور کے مطابق ۳۲ روپے قرار پاتی ہے اس دور میں یہ رقم مہر کے لئے مناسب نہیں ہے اس لئے اس کو بڑھا کر' اسلامی حکومت' لوگوں کے اپنے اپنے حالات کے مطابق مقرر کر دے گی۔ رقم کا تعین چونکہ حضور کے دور اور خلافت راشدہ میں بھی ہوا تھا۔ اس لئے اس کا تعین کرنا اتباع سنت ہے اور اس رقم کو موجودہ حالات کے مطابق کرنا قیاس ہے' اور اس دور کی اسلامی حکومت کے ارکان' یا مجلس شوریٰ یا پارلیمنٹ کا اس کو پاس کر دینا اجماع ہے۔ اس طریقہ کار Procedure کے مطابق حکم تو صرف قرآن کریم کا ہو گا' لیکن اس کو جاری کرنے میں اتباع سنت' قیاس و اجماع سب شامل ہو جائیں گے۔ ہمارے فقہا کے نزدیک صورت حال یہ نہیں ہے ان کا خیال ہے کہ حضورﷺ کے دور اور خلافت راشدہ میں ایک رقم (مثلاً ۳۲ روپے) مقرر ہو گئی تھی' اب اس میں ترمیم نہیں ہو سکتی' وہ اس کو اتباع سنت قرار دیتے ہیں اور اسی طرح اس دور کا اجماع' قانون کا ماخذ بن جاتا ہے۔

اس Process کو زیادہ واضح کرنے کے لئے ایتائے زکوٰۃ کی عملی شکل تحریر کی جاتی ہے۔ قرآن کریم نے ایتائے زکوٰۃ کا حکم دیا۔ حضور کے دور اور خلافت راشدہ میں زکوٰۃ کی شرح اڑھائی فیصد تھی۔ لیکن اس وقت زکوٰۃ یا حکومت کے ٹیکس کے لئے یہ اڑھائی فیصد کافی نہیں ہے۔ موجودہ دور کی اسلامی حکومت اس کو دس فیصد کر سکتی ہے۔ زکوٰۃ کی شرح کو چونکہ حضور کے دور اور خلافت راشدہ میں مقرر کیا گیا تھا' اس لئے اس کا مقرر کرنا اور اس کا تعین کرنا' اتباع سنت ہے۔ چونکہ اس دور کی اسلامی حکومت' موجودہ دور کے حالات کے مطابق' اس کو دس فیصد مقرر کرے گی' اس لئے اس کا دس فیصد مقرر کرنا' قیاس ہے اور اسلامی حکومت کی پارلیمنٹ کا اس پر متفق ہونا' اجماع ہے۔ لیکن ہمارے علماء کرام کے لئے پھر وہی صورت ہے کہ وہ اس اڑھائی فیصد میں تبدیلی نہیں کر سکتے۔

قرآن کریم نے (۸/۶۰) میں حکم دیا ہے کہ جس قدر بھی قوت تیار رکھ سکو' تیار رکھو مثلاً سرحدوں پر گھوڑوں کے رسالے باندھو تا کہ اپنے اور اللہ کے دشمنوں کو ڈرا سکو۔ صحیح مسلم شریف میں ہے کہ حضورﷺ نے ارشاد فرمایا جو تیر اندازی جانتا ہو' پھر اسے ترک کر دے' وہ ہم میں سے نہیں۔ کس درجہ شدید تہدید ہے۔ لیکن یہ اس دور کی ہے۔ اس دور میں اسلامی حکومت جو بھی قوت فراہم کرے

گی وہ اتباع سنت ہو گی۔ جو ہتھیار بھی' اس دور کے لئے مناسب خیال کر کے حکومت خریدے گی وہ اس کا قیاس ہوگا اور حکومت کے ارکان کا اس پر اتفاق اجماع ہوگا۔ یہی چور کی سزا کا معاملہ ہے۔ کسی معمولی چیز کی چوری پر ہاتھ کاٹنے کی سزا نہیں دی جا سکتی۔ حضورﷺ کے دور میں چوری کی مالیت کو Define کیا گیا تھا۔ اس دور میں چوری کی مالیت کو' موجودہ دور کے مطابق مقرر کرنا ہوگا' چوری کی مالیت کا مقرر کرنا سنت ہے۔ اس کی مالیت کا مقرر کرنا قیاس ہے اور حکومت کو بالاتفاق اس کو جاری کرنا' اجماع ہے۔

قرآن کریم کی رو سے اسلامی حکومت میں قانون سازی کی عملی شکل یہ ہوتی ہے۔

جو حضرات کفایتِ قرآن کے قائل ہیں' ان کو ہمارے علماء کرام مطعون کرتے ہیں کہ وہ اطاعتِ رسولؐ کے معاذ اللہ منکر ہیں۔ حالانکہ صورت حال اس سے بالکل مختلف ہے جبکہ حقیقت یہ ہے کہ ہمارے علماء کرام خود اطاعتِ رسولؐ کے قائل نہیں ہیں۔ یہ جو چار مثالیں اوپر تحریر کی گئی ہیں' اس قسم کے بے شمار مثالیں اور بھی پیش کی جا سکتی ہیں۔ ہمارے علمائے کرام کا نظریہ ہے کہ حضور جو کچھ کرتے تھے وہ صرف وحی خفی کی رو سے کرتے تھے' مثلاً مہر کا تعین' زکوٰۃ کی شرح کا تعین' چوری کی مالیت کا تعین یہ سب حضورؐ نے وحی خفی سے کیا ہے۔ اس میں حضورؐ کی اپنی انتظامی' عقلی' کارگزاری کا کوئی دخل نہیں تھا اور چونکہ یہ سب وحی خفی پر مبنی ہیں اسی لئے ان میں کبھی بھی ترمیم نہیں ہو سکتی۔ یہ واضح رہے کہ وحی کی اطاعت سے اللہ کی اطاعت ہوتی ہے حضورؐ کی اطاعت نہیں ہوتی۔ یہ عجیب بات ہے کہ ہمارے علمائے کرام ایک وحی یعنی قرآن کی اطاعت کو تو اللہ کی اطاعت قرار دیتے ہیں اور دوسری وحی جو بقول ان کے مثلہٗ معہٗ یعنی بالکل اس کی مثل ہے' اس کی اطاعت کو رسول کی اطاعت قرار دے دیتے ہیں اور یہی وہ مقام ہے جہاں سے مسلمانوں کی تباہی و بربادی شروع ہوتی ہے۔

ہمارے علماء کرام حضورﷺ کی عقلی' اجتہادی' انتظامی' اطاعت کے قائل نہیں ہیں۔ وہ صرف وحی کی اطاعت کے قائل ہیں۔ انہوں نے حضورﷺ کی عقلی و انتظامی اطاعت کو' جو اطاعت صرف آپ کی زندگی تک محدود تھی' اس کو بالکل نظرانداز کر دیا حالانکہ یہی اطاعت آگے چل کر خلفاء کی طرف منتقل ہو جاتی ہے۔ ان کے نزدیک حضورؐ کی عقلی اطاعت نہ فرض ہے اور نہ واجب جبکہ ہمارے نزدیک یہی اطاعت خلفاء کی طرف منتقل ہو جاتی ہے اور ان (خلفاء) کی اطاعت اللہ و رسولؐ کی اطاعت بن جاتی ہے۔ جبکہ ہمارے علماء کرام اس کو وحی خفی قرار دے کر' اس اطاعت کو استقلال و بقاء بھی دیتے ہیں اور اس کو احادیث کی طرف منتقل کر دیتے ہیں اور یہیں سے دین مذہب میں تبدیل ہو کر مسلمانوں کی تباہی کا باعث بنتا ہے۔ کیونکہ اس طرح اطاعتِ رسولؐ کے لئے زندہ اتھارٹی کی

ضرورت ہی نہیں رہتی۔ کیونکہ پھر اطاعت رسول کے لئے احادیث کافی خیال کی جاتی ہیں۔

دین و مذہب میں قانون سازی کے فاصلے آپ نے ملاحظہ فرمائے۔ اب مسلمانوں کی بقاء وسلامتی کی یہی راہ ہے کہ قرآن کریم کا نظام قائم کیا جائے اور صرف قرآن کو ماخذ قانون قرار دے کر' حالات حاضرہ کو پیش نگاہ رکھ کر' قوانین بنائے جائیں۔ سابقہ ادوار کے قوانین جو فقہ اسلامی کہلاتے ہیں ان کو مسترد کر دیا جائے' کیونکہ اول تو ان کا بیشتر حصہ قرآن کے خلاف ہے' دوئم یہ کہ وہ اپنے اپنے ادوار کو پیش نظر رکھ کر' اپنی ضرورتوں کے لئے بنائے گئے تھے۔ سوئم یہ کہ وہ مذہب کی رو سے تحریر کئے گئے تھے' جن کے ماخذ ہی قرآن کے خلاف ہیں۔ اگر مسلمانوں کی قسمت نے یاوری کی' اور کسی جگہ اسلامی حکومت قائم ہوئی تو وہاں اسی طرح قانون سازی ہوگی۔ ہر دور کی اسلامی حکومت کے قانون ہی اس کی شریعت اور اس کا فقہ ہوتا ہے۔ سابقہ حکومتوں کے قوانین' آنے والی حکومتوں کے لئے شریعت یا فقہ نہیں بن سکتے اور نہ ہی آنے والی حکومتیں ان کی اطاعت کی مکلّف ہوتی ہیں۔ ہر نئی اسلامی حکومت قرآن کی حدود میں رہ کر' اپنے حالات کے مطابق قوانین بناتی ہے اور اس کی اطاعت عبادت خداوندی ہوتی ہے۔ یہ واضح رہے کہ اسلامی حکومت میں پبلک لاء اور پرسنل لاء کی تفریق نہیں ہوتی۔ یہ تفریق سیکولر حکومتوں میں ہوتی ہے۔ اسلامی حکومت میں صرف ایک قانون جاری ہوتا ہے۔ جس کی اطاعت تمام رعایا کرتی ہے۔ اس میں نہ تو فرقے ہوتے ہیں اور نہ ہی مختلف فرقوں کے الگ الگ قانون۔ اس میں قانون کا Source صرف قرآن ہوتا ہے اور سنت' اجماع' قیاس' قانون سازی کے مختلف مراحل وطریقے ہوتے ہیں۔

مندرجہ بالا موضوع پر یہ مضمون یہاں ختم ہوتا ہے۔ البتہ یہاں ایک غلط فہمی کا ازالہ کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ جیسا کہ سابقہ مضامین میں تحریر کیا جا چکا ہے کہ ہمارا یہ دور اس معاملہ میں بڑا خوش قسمت ہے کہ صدرِ اول کے بعد' یہ پہلا موقع ہے کہ دین کا تصور اس درجہ واضح ہو کر سامنے آیا ہے اور دین کے علمبرداروں کے لئے یہ بڑا آزمائش کا دور ہے۔ اگر اس مرتبہ پھر اس تصور کو عام نہ کر سکے' تو پھر ایک ہزار سال تک دوبارہ دین کا قیام مشکل رہے گا۔ انقلاب ایران سے بڑی توقعات وابستہ تھیں اور ساری دنیا کی نگاہیں اس کی طرف لگی ہوئی تھیں لیکن افسوس کہ چونکہ وہ قرآن کریم کے مطابق نہیں تھا' اس لئے وہ کامیاب نہیں ہو سکا۔ یہ رسالہ فرقہ بندی سے بالاتر ہے۔ اس لئے اس میں' اس انقلاب کے ناکام ہونے کی وجوہات تحریر کرنے سے اجتناب کیا جاتا ہے۔ البتہ اگر کوئی شیعہ مسلک کا رسالہ' اس قسم کے مضمون کو طبع کرنا چاہے' تو اس میں ایران کے انقلاب کے غیر قرآنی عناصر کی نشاندہی اور اس کے ناکام

ہونے کی وجوہات تحریر کی جا سکتی ہیں اور ان خامیوں کو سامنے لانے سے ان کو ہی فائدہ ہوگا۔

ہمارے ہاں ایک غلط تصور یہ عام ہو چکا ہے کہ اگر مذہب میں اصلاح وترمیم کر دی جائے اور اس کو موجودہ حالات کے مطابق کر دیا جائے تو مسلمانوں کی قسمت بدل سکتی ہے۔ یہ ایک عام خیال ہے۔ ہمارے ہاں مختلف ٹی۔وی چینلز پر قرآن کریم سے متعلق کثرت سے پروگرام آرہے ہیں۔ بیشتر لوگ' جو مذہب کے ہی داعی ہیں' بات بات پر آیات کے حوالے دیتے ہیں' ان کی اس ادا پر لوگ ان کے گرویدہ ہو جاتے ہیں۔حکومت بھی اپنی وسعت اور مصلحتوں کے مطابق اسلامی ادارے قائم کر رہی ہے لیکن یہ سب مذہب کو ٹھوک پیٹ کے لئے درست کرنے کا طریقہ ہے۔ مذہب اور دین ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ مذہب کی اصلاح کے بعد مذہب دین نہیں بن جاتا۔ بلکہ دین مذہب کی جگہ آتا ہے۔ پہلے مذہب کو بالکل جڑ بنیاد سے اکھاڑ دیں' تب دین کا قیام عمل میں آتا ہے۔ دین اور مذہب میں کبھی مفاہمت نہیں ہوسکتی۔کوئی شخص دین کا داعی ہوگا یا مذہب کا۔ قرآنی آیات کے بکثرت حوالے دینے سے' مذہب کا داعی دین کا داعی نہیں بن جاتا۔ یہ نکتہ ہمیشہ پیش نظر رکھئے۔

ومن احسن قولاً ممن دعا الی اللہ وعمل صالحاً وقال اننی من المسلمین (۴۱/۳۳)۔

اور اس سے بہتر کس کی بات ہوسکتی جو لوگوں کو خدا کی طرف بلائے اور اچھے اچھے کام کرے اور کہے کہ میں بھی یقیناً خدا کے فرمانبرداروں میں سے ہوں۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

منصور سرمدی، راولپنڈی
mansoor_sarmadi@yahoo.com

شُد پریشاں خوابِ من از کثرتِ تعبیرھا (۴)

(فکرِ غامدی پہ اِک نظر)

(نوٹ: ربطِ مضمون کے لئے مئی کا شمارہ ملاحظہ کیجئے)

گر تو می خواہی مسلماں زیستن
نیست ممکن جز بہ قرآں زیستن

عقیدۂ ناسخ ومنسوخ

امت مسلمہ کو قرآنی تعلیمات سے بیگانہ کرنے کے لئے ایسے ایسے عقائد وضع کئے گئے جو نظر بظاہر بڑے مقدس اور معصوم تھے مگر درحقیقت ان کا مقصد وحیِ خداوندی کی ترویج واشاعت کا قلع قمع کرنا تھا۔ ان میں کا سب سے زیادہ خطرناک عقیدہ ناسخ ومنسوخ فی القرآن کا عقیدہ ہے۔ اس عقیدہ کے زیرِ اثر کہا جاتا ہے کہ:

۱۔ قرآن کے اندر ایسی آیات موجود ہیں جن کا حکم بعض دوسری آیات سے منسوخ ہو چکا ہے۔ اسے نسخ القرآن بالقرآن سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

۲۔ قرآن کے اندر متعدد آیات ایسی ہیں جن کی تلاوت تو کی جائے گی مگر انہیں رسول اللہ ﷺ نے منسوخ قرار دے دیا۔ اصطلاح میں اسے نسخ القرآن بالحدیث کہا جاتا ہے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ قرآن کی بعض آیات ایسی بھی ہیں جو موجودہ قرآن میں شامل نہیں ہیں۔ ان کی تلاوت تو منسوخ ہو چکی ہے مگر حکم ابھی باقی ہے۔ اس ضمن میں شادی شدہ زانی کے لئے رجم کی سزا اور رضاعتِ کبیر والی آیات کو مثال کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔

قرآن حکیم سے متعلق یہ عقیدہ، حقیقت یہ ہے کہ خدا اور اس کے کلام پر ایمان محکم کی ساری عمارت کو مسمار کر دیتا ہے۔ ایک ایسی کتاب جسے قیامت تک کے لئے بنی نوع انسان کی ہدایت کے لئے نازل کیا گیا ہو، جس کے نزول کے بعد سلسلۂ نبوت ختم کر دیا گیا ہو اور سب سے بڑھ کر یہ کہ جس کی حفاظت کی ذمہ داری خود خدا نے لے رکھی ہو، کے متعلق یہ تصور کہ اس کی بہت سی آیات منسوخ ہو چکی ہیں، سچی بات یہ ہے کہ ایک مسلمان کے رونگھٹے کھڑے کر دینے

کے لئے کافی ہے۔ یہ عقیدہ تیسری اور چوتھی صدی ہجری کا پیدا کردہ ہے جب وضعی روایات کا بازار نہ صرف گرم کیا گیا تھا بلکہ اپنے عروج پر تھا۔ پروفیسر رفیع اللہ شہاب مرحوم اس ضمن میں تحریر کرتے ہیں:

''محققین نے آج علمی تحقیق کے ذریعے ثابت کر دکھایا ہے کہ قرآنی آیات کو منسوخ ماننے کا عقیدہ دشمنانِ اسلام کی سازش تھی۔ سب سے پہلے اس موضوع پر آج سے ایک ہزار سال پہلے مصر کے دو علماء نے لکھا تھا اور مزے کی بات تو یہ ہے کہ ان میں ایک اندھا تھا اور دوسرا پاگل' اور پاگل بھی ایسا کہ پاگل پن کے غلبے کے نتیجے میں دریائے نیل میں چھلانگ لگا کر خودکشی کر لی تھی۔''

(احکام القرآن میں تحریف' ص۲۳)

نسخ القرآن بالقرآن

محترم غامدی صاحب نسخ القرآن بالقرآن کے نہ صرف قائل ہیں بلکہ انہیں نہایت قطعیت کے ساتھ اس کا اِدعا ہے۔قرآنِ کریم نے سورۂ بقرہ میں وصیت کو فرض قرار دیا ہے' ارشاد ہے:

''تم پر فرض کر دیا گیا ہے کہ جب تم میں سے کسی کی موت کا وقت آن پہنچے تو اگر وہ مال چھوڑ رہا ہو تو والدین اور قریبی رشتہ داروں کے لئے وصیت کرے۔ یہ متقیوں پر حق ہے۔''(۲/۱۸۰)۔

اس آیت کے متعلق موصوف تحریر فرماتے ہیں:

''سورۂ نساء میں تقسیم وراثت کی جو آیات اس کے بعد زیر بحث آئیں گی ان میں حصوں کا تعین اور مصحف میں ان کی جگہ صاف بتاتی ہے کہ والدین اور قرابت مندوں کے لئے دستور کے مطابق وصیت کا یہ حکم اس وقت نازل ہوا جب وہ آیات ابھی نازل نہیں ہوئی تھیں............ لہٰذا یہ بات تو بالکل قطعی ہے کہ سورۂ بقرہ کی اس آیت کا حکم منسوخ ہو گیا ہے۔''

(میزان' طبع دوم' ص۱۶۴)

اس کے بعد انہوں نے سورۂ نساء کی آیت ۱۱ کا متن اور اس کا ترجمہ دینے کے بعد لکھا ہے کہ:

''سورۂ نساء میں تقسیم وراثت کا یہی حکم ہے جس سے اوپر کی آیت کا حکم منسوخ ہوا ہے۔''

(حوالہ ایضاً)

ہمارے احبار و رہبان جب کسی آیت کا منشا سمجھ نہیں پاتے تو فوراً اسے منسوخ قرار دے ڈالتے ہیں۔ اس طرح سے وہ تحقیق اور فکر و تدبر کی زحمت سے بھی بچ جاتے ہیں اور تقلید کے صدقے اسلاف سے بھی ان کا رشتہ جڑا رہتا ہے۔

قرآنِ کریم میں وصیت کا حکم بھی دیا گیا ہے اور وراثت کی تقسیم کے احکام بھی موجود ہیں۔ ان میں کوئی تضاد

یا تخالف سرے سے موجود ہی نہیں ہے۔جس کی وجہ سے کسی آیت کو منسوخ قرار دینا پڑے۔ وصیت اور وراثت دو الگ الگ احکامات ہیں جن میں سے وصیت مقدم ہے۔ سورۂ بقرہ میں اللہ نے وصیت کو فرض قرار دیا ہے اور سورۂ نساء میں جہاں قرابت داروں کے حصے بیان کئے گئے ہیں' وہاں بالبداہت ہدایت کی گئی ہے کہ:

من بعد وصیتہ یوصی بھا او دین (۴/ ۱۲)۔

''(وراثت کے یہ حصے) مرنے والے کی وصیت پوری کرنے کے بعد ادا کیے جائیں یا میت کے ذمے واجب الادا قرض چکانے کے بعد۔''

اس سے اگلی آیت میں یہی الفاظ معمولی تغیرات کے ساتھ تین مرتبہ آئے ہیں۔ ہر دفعہ جب خدا نے مختلف قرابت داروں کے حصے بیان کیے تو تاکیداً کہا ہے کہ یہ سب حصے میت کی وصیت پوری کرنے کے بعد اور/ یا اس کے ذمے واجب الادا قرض چکانے کے بعد' تقسیم کئے جائیں گے' ارشاد ہے:

... من بعد وصیتہ یوصین بھا او دین (وصیت نکالنے کے بعد جس کی وہ وصیت کر جائیں یا ادائے قرض کے بعد)... من بعد وصیتہ توصون بھا او دین (بعد وصیت نکالنے کے جس کی تم وصیت کر جاؤ یا ادائے قرض کے بعد)... من بعد وصیتہ یوصی بھا او دین (بعد وصیت نکالنے کے جس کی وصیت کی گئی ہو یا ادائے قرض کے بعد)۔۔۔(۴/۱۲)۔

آیت (۴/۱۲) میں قوسین میں دیے گئے تراجم ہم نے وحیدالدین خان کی تفسیر تذکیر القرآن سے لئے ہیں جو کہ غامدی صاحب کے ممدوح ہیں۔ مبادا یہ نہ کہہ دیا جائے کہ ترجمہ درست نہیں کیا گیا۔

اب اگر کسی کے دماغ میں ذرا سی بھی عقل سلیم ہو تو وہ اس قرآنی منشاء کو سمجھنے میں دیر نہیں لگائے گا کہ وصیت کرنا ہر مومن پر فرض قرار دیا گیا ہے۔ اگر کسی وجہ سے وہ وصیت کیے بغیر فوت ہو جائے یا ترکہ اتنا زیادہ ہو کہ وہ وصیت اور/ یا قرض چکانے کے بعد بھی بچ رہے تو اسے وراثت کی تقسیم والے قرآنی احکام کے مطابق بانٹا جائے گا۔ یہ وصیت اور وراثت کے احکام تھے کوئی مابعد الطبیعاتی مضمون نہیں تھا جس میں غامدی صاحب کے فہم کو دشوار گذار گھاٹیوں سے گذرنا پڑتا۔لیکن انسان کی آنکھوں پر تقلید کی پٹی بندھی ہو تو قرآن کی روشنی اسے کیا فائدہ دے سکتی ہے؟ دل کے سنگھاسن پر اگر کسی صاحبِ ''تدبر القرآن''[1] یا صاحبِ ''تذکیر القرآن''[2] کا بت براجمان ہو تو پھر خدا کے

[1] جناب امین احسن صاحب اصلاحی۔ [2] جناب وحیدالدین خان صاحب۔

نازل کردہ قرآن کو سمجھنا ناممکن ہو جاتا ہے۔موصوف نے جب دیکھا کہ اگلوں نے آیت وصیت کو وراثت کے احکام سے منسوخ قرار دے رکھا ہے تو انہوں نے اس پر تدبر و تفکر کی ضرورت محسوس نہیں کی اور روا روی میں وہی کچھ لکھ ڈالا جو اسلاف لکھتے چلے آئے تھے۔اگلوں نے اگر غلطی کی ہے تو ہم پر یہ کہاں سے واجب ہو گیا کہ ہم آنکھیں بند کر کے نسلاً بعد نسلٍ اس غلطی کو دہراتے چلے جائیں؟

موصوف نے قرآنی آیات کے نسخ کی ایک اور مثال بھی دی ہے مگر اسے پیش کرنے سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ قرآنِ کریم سے متعلق ان کا نقطۂ نظر انہی کے الفاظ میں بیان کر دیا جائے۔اسے پڑھ کر قارئین جان سکیں گے کہ قرآن مُلّا کی سمجھ میں کیوں نہیں آتا۔موصوف فرماتے ہیں کہ:

''بعض لوگ قرآن مجید کے معاملے میں ایک شیطانی فلسفے کا شکار ہو جاتے ہیں۔ان کا استدلال یہ ہوتا ہے کہ قرآن مجید چونکہ سب کے لئے ہے لہٰذا اسے ہر آدمی کی راہنمائی براہ راست کرنی چاہئے۔اس طرز فکر کا حامل آدمی ایک ضدی اور ہٹ دھرم آدمی کی حیثیت سے سامنے آتا ہے۔اسے نہ قرآن مجید سے حق ملتا ہے اور نہ کوئی دوسرا ہے جو اسے راہ راست پہ لا سکتا ہے۔یہاں یہ بات واضح رہنی چاہئے کہ تذکیر و نصیحت کے لئے قرآن مجید ایک سہل ترین کتاب ہے لیکن علمی اور تحقیقی مقاصد کے لئے اس کی طرف رجوع کیا جائے تو یہ ایک نہایت ہی مشکل کتاب ہے۔''

گویا یہ عقیدہ رکھنا یا یہ سمجھنا کہ قرآن سب انسانوں کے لئے ہدایت ہے' ایک شیطانی فلسفہ ہے۔یہ کچھ اس قرآن کے بارے میں کہا جا رہا ہے جس کے نازل کرنے والے نے ببانگ دہل کہا ہے کہ یہ قرآن ھدی للناس ہے(۲/۱۸۵'۳/۳) یعنی یہ بنی نوع انساں کے لئے ہدایت ہے۔یہ قرآن متعدد مقامات پر بنی نوع انسان کو براہِ راست خطاب کرتا ہے' مثلاً (۴/۱۷۵' ۱۵۸/۷' ۱۰/۱۰۸)۔یہ وہ کتاب ہے جسے حق کے ساتھ بنی نوع انسان کی طرف نازل کیا گیا ہے۔ارشاد ہے:

انا انزلنا علیک الکتب للناس بالحق (۳۹/۴۱)۔

لیکن قرآن کی ان تصریحات کے علی الرغم' غامدی صاحب کا فتویٰ ہے کہ ایسا عقیدہ رکھنا ایک شیطانی فلسفہ ہے۔موصوف کے نزدیک قرآن کریم شاید ''فضائل اعمال'' یا ''فیضانِ سنت'' جیسی کوئی کتاب ہے جو لوگوں کو دوزخ اور قبر کی ہولناکیوں سے ڈرانے اور جنت کے نعما کی ترغیب دلانے کے لئے تذکیر و نصیحت کے لئے پڑھی اور پڑھائی جائے تو آسان ترین کتاب ہے لیکن اگر اسے علمی و تحقیقی اغراض کے لئے پڑھا جائے تو یہ ایک ''نہایت ہی مشکل'' کتاب ہے۔

مثال کے طور پر اگر کوئی شخص نکاح و طلاق کے مسائل' وراثت کے حصص' زنا کی سزا یا قصاص و دیت کے معاملات جاننا چاہے تو اس کے لئے' موصوف کے مطابق' قرآن مجید مشکل ترین کتاب ہے۔ ہمارے احبار و رہبان کی حوصلہ مندی کی داد دینی پڑتی ہے۔ بجائے اس کے کہ اپنے عجز کا اعتراف کیا جائے' الٹا قرآن کریم ہی کو مشکل بتایا جاتا ہے تاکہ عوام الناس اس کے قریب بھی نہ پھٹکیں۔ وہ کبھی قرآن کریم سے براہِ راست راہنمائی حاصل کرنے کا تصور بھی نہ کر سکیں بلکہ صاحبانِ جُبہّ و دستار کے دست نگر رہیں۔ ؎

اس بے بسی میں ذوقِ یہ عالم بشر کا ہے
کیا جانے کیا کرے جو خدا اختیار دے

قرآن کریم اپنے مدعا کو دو اور دو چار کی طرح وضاحت سے بیان کرتا ہے۔ وراثت جیسے مشکل ترین مسئلے کو اس نے صرف چار آیات میں اس جامعیت سے بیان کر دیا ہے کہ وراثت سے متعلق کوئی تفصیل ایسی نہیں جو ان آیات میں سمٹ کر نہ آ گئی ہو۔ اس صورت حال میں قرآن کے مشکل ترین ہونے کا ڈھنڈورا پیٹنا گویا اپنی ٹانگ کھولنا اور آپ ہی لاجوں مرنا ہے۔

موصوف نے قرآنی آیات کے نسخ کی دوسری مثال روزوں کے احکام سے متعلق دی ہے' لکھتے ہیں:

''ابتدائی طور پر قرآن مجید نے رخصت دی تھی کہ اگر کوئی شخص حالتِ مرض میں یا حالت سفر میں ہونے کی وجہ سے روزے چھوڑنا چاہے تو وہ بعد میں چھوڑے ہوئے روزوں کو پورا کر لے یا پھر ایک روزے کے بدلے میں ایک مسکین کو کھانا کھلا دے۔ ارشاد ہے:

فمن کان منکم مریضاً او علی سفر فعدة من ایام افرو علی الذین یطیقونه فدیته طعام مسکین (البقرہ:۱۸۴)۔

''اس پر بھی جو کوئی مریض ہو یا سفر میں ہو تو دوسرے دنوں میں تعداد پوری کر دے اور جو لوگ ایک مسکین کو کھانا کھلا سکیں' ان پر ایک روزے کا بدلہ ایک مسکین کا کھانا ہے۔''

بعد ازاں قرآن مجید نے مسکین کو کھانا کھلا کر روزے سے بری ہونے کی اجازت ختم کر دی۔

ومن کان مریضا او علی سفر فعدة من ایام اخر۔

''اور جو کوئی بیمار ہو یا سفر میں ہو تو وہ دوسرے دنوں میں گنتی پوری کر لے''۔

(اشراق' دسمبر ۲۰۰۰ء' ص ۶۳)

یہاں پر غامدی صاحب کو جس وجہ سے آیت کے ایک حصے کو منسوخ کرنے کی ضرورت پیش آئی ہے وہ ان کا غلط ترجمہ ہے جو انہوں نے الفاظ

و علی الذین یطیقونه

کا کیا ہے۔اس کا ترجمہ انہوں نے یہ کیا ہے۔

''جو لوگ ایک مسکین کو کھانا کھلا سکیں۔''

موصوف کو یوں تو اپنی عربیت' اسالیب کلام اور عربی صرف و نحو کی مہارت کا بہت زعم ہے مگر ان کے اس ترجمے سے ان کی مہارت کا سارا پول کھل جاتا ہے۔اس ترجمے میں دو فاش غلطیاں موجود ہیں۔پہلی غلطی تو یہ ہے کہ اس میں ''یطیقونه'' کی ضمیر ''صیام'' کی بجائے ''طعام'' کی طرف راجع ہے جو کہ صرف ونحو کے اصول کے خلاف ہے۔ گرائمر اور جاہلی ادب کی کتابیں انسان اگر حفظ بھی کر لے تو اس کو یہ اختیار حاصل نہیں ہو جاتا کہ وہ مسلمہ اصولوں کے برعکس کسی بھی طرف ضمیر کو پھیر دے۔اس طرح تو ہر شخص صرف ونحو کی چند کتابیں پڑھ لینے کے بعد فاعل کو مفعول اور مفعول کو فاعل قرار دے کر کوئی بھی معنی پیدا کر سکتا ہے۔

مودودی صاحب نے ان الفاظ کا ترجمہ یوں کیا ہے:

''جو لوگ اس کی (یعنی روزے کی) طاقت رکھتے ہوں''

(مضمون بعنوان ''نیا فتنہ'' ۔ترجمان القرآن' اپریل ومئی ۱۹۵۲ء)

دیکھ لیجئے' مودودی مرحوم نے یطیقونه کی ضمیر ''صیام'' کی طرف راجع قرار دی ہے اور یہی صحیح ہے۔مگر دوسری غلطی جو غامدی صاحب نے ان الفاظ کے ترجمے میں کی ہے وہ یطیقونہ کا ترجمہ 'طاقت یا سکت' ہے۔مودودی صاحب نے بھی اس کا ترجمہ 'طاقت' ہی کیا ہے اور اس سے وہی مفہوم مراد لیا ہے جو اردو زبان میں لفظ طاقت کا لیا جاتا ہی۔حالانکہ عربی زبان میں طاقت کا وہ مفہوم نہیں ہے جو اردو میں سمجھا جاتا ہے۔

عربی زبان کی مشہور لغت 'محیط المحیط' جلد دوم' ص ۱۳۰۴ کے مطابق:

''طاقت کے معنی ہیں کسی چیز پر قدرت رکھنا' لیکن یہ ایک ایسی مقدار کا نام ہے جسے انسان بہ مشقت کر سکے اور دراصل یہ اس طوق کے ساتھ تشبیہ ہے جو کسی چیز کا محیط ہو۔چنانچہ لا تحملنا مالا طاقة لنا به (۲/۲۸۶) کے معنی یہ نہیں کہ جس کی ہمیں قدرت نہ ہو بلکہ اس کے معنی یہ ہیں کہ جس کا بجالانا ہمیں دشوار ہو۔''

اتفاق سے طلوع اسلام کے شمارہ اکتوبر ۲۰۰۶ء میں اس آیت پر بڑی مفید بحث کی گئی ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ مفتی محمد عبدہ' زمخشری' صاحبِ روح المعانی علامہ آلوسی اور القرطبی جیسے مشاہیر اس بارے میں کیا رائے رکھتے ہیں۔ قارئین کرام سے گذارش ہے کہ وہ مذکورہ شمارہ کا مطالعہ ضرور کریں۔ہم یہاں پر صرف علامہ جار اللہ زمخشری' جو اتفاق سے غامدی صاحب کے ہاں بھی قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں' کی تفسیر کشاف سے ایک اقتباس دے کر اپنے موضوع کی طرف آنا چاہتے ہیں۔وہ لکھتے ہیں:

''طاقت کے معنی وہ کام ہیں جنہیں بہ تکلف یا بہ مشقت کیا جائے اور وعلی الذین یطیقونہ سے مراد بوڑھے مرد اور بوڑھی عورتیں ہیں جن کے لئے روزہ نہ رکھ کر فدیہ دینے کا حکم ہے۔ چنانچہ اسی بناء پر یہ آیت ثابت ہے' منسوخ نہیں ہے۔''

(الکشاف' ج ۱' ص ۲۵۵)

لٰہذا مذکورہ آیت کا صحیح ترجمہ یوں ہوگا:

''پھر جو کوئی بیمار ہو یا مسافر ہو تو وہ دوسرے دنوں میں روزے کی تعداد پوری کرے اور وہ لوگ جو بہ دشواری روزہ رکھ سکیں ان کے ذمے ایک روزے کے بدلے ایک مسکین کا کھانا ہے۔''

دیکھ لیجئے' مندرجہ صدر ترجمے کے بعد کسی آیت کو خواہ مخواہ منسوخ قرار دینے کی نوبت ہی نہیں آتی۔ غامدی صاحب کے ترجمے سے یہ بات بھی سامنے آتی ہے کہ اللہ تعالیٰ گویا یہ چاہتا ہے کہ مریض اور مسافر حضرات تو چھوڑے ہوئے روزوں کی گنتی دوسرے دنوں میں پوری کریں مگر جو لوگ صاحبِ ثروت ہوں اور مساکین کو کھانا کھلا سکیں وہ ہر روزے کے بدلے ایک مسکین کو کھانا کھلا دیں۔ یعنی بہ الفاظ دیگر جو لوگ ہٹے کٹے ہوں اور مسکین کو کھانا کھلانے کی طاقت رکھتے ہوں وہ تو فدیہ دے دیں اور روزہ وہ لوگ رکھیں جو روزہ رکھنے کی طاقت نہ رکھتے ہوں یا مسکین کو کھانا کھلانے کی طاقت نہ رکھتے ہوں۔

حکم قرآنی کی اس تشریح کو جو موصوف نے فرمائی ہے کسی سلیم العقل انسان کے سامنے رکھئے اور پھر اس سے پوچھئے کہ قرآن کے متعلق وہ کیا تصور قائم کرتا ہے۔ غامدی صاحب نے' جیسا کہ قارئین نے گزشتہ مضامین میں بھی ملاحظہ کیا ہوگا' نبوت و رسالت' جہاد' دین کے ماخذ اور روزوں کے احکام والی آیت کی تفسیر جس طریقے سے فرمائی ہے انہیں پڑھ کر آدمی قرآن سے متعلق سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ کیا یہی وہ کلام ہے جس کے بارے میں دعویٰ کیا گیا کہ جن و انس اس کی نظیر پیش کرنے سے قاصر رہے اور جو اس کرہ ارض پر حسن بیان اور فصاحت و بلاغت کا ایک لافانی معجزہ قرار پایا؟ ہمارا خیال ہے کہ موصوف کے اس قسم کے تفسیری نکات کے بعد تو یہ ماننا بھی مشکل ہو جاتا ہے کہ یہ فی الواقع کوئی بامعنی کلام بھی ہے جس کی طرف انسان ہدایت کے لئے رجوع کر سکتا ہے۔

ہمارے احبار و رہبان ناسخ و منسوخ کے عقیدے کے جواز کے لئے عام طور پر جو نص پیش کرتے ہیں' وہ سورۂ بقرہ کی یہ آیت ہے:

ما ننسخ من اٰیة او ننسھا نات بخیر منھا ...... (۲/۱۰۶)

جو آیتیں ہم منسوخ کر دیتے ہیں یا بھلا دیتے ہیں تو ہم ان سے بہتر یا ان جیسی اور آیات لے آتے

ہیں۔‘‘

یہ بات واضح رہنی چاہئے کہ قرآن کریم میں ایک بھی آیت ایسی نہیں ہے جس کے متعلق خدا نے کہا ہو کہ یہ اب منسوخ ہو چکی ہے یا فلاں آیت اس کی ناسخ ہے۔ مندرجہ بالا آیت کو سیاق و سباق کے حوالے سے دیکھا جائے تو یہودیوں اور دیگر اہل کتاب کے اعتراضات کے جواب کے طور پر اسے پیش کیا گیا۔ مودودی مرحوم اس سلسلے میں ارشاد فرماتے ہیں:

’’یہ ایک خاص شبہ کا جواب ہے جو یہودی مسلمانوں کے دلوں میں ڈالنے کی کوشش کرتے تھے۔ ان کا اعتراض یہ تھا کہ اگر پچھلی کتابیں بھی خدا کی طرف سے آئی تھیں اور یہ قرآن بھی خدا کی طرف سے ہے تو ان کے بعض احکام کی جگہ اس میں دوسرے احکام کیوں دیے گئے ہیں۔ ایک ہی خدا کی طرف سے مختلف وقتوں میں مختلف احکام کیسے ہو سکتے ہیں۔ (تفہیم القرآن، جلد اول، ص ۱۰۱)

مذکورہ آیت کا صحیح مفہوم یہی ہے مگر حیرت کی بات یہ ہے کہ اس موقف کے باوجود مودودی صاحب نسخ القرآن بالقرآن کے قائل تھے۔ یاد رہے کہ قرآن کی کوئی آیت بھی منسوخ نہیں ہے البتہ ایسی صورتِ حال ضرور ہے کہ قرآن کے بعض احکام بعض مخصوص حالات یا شرائط سے مشروط ہیں۔ اگر وہ شرائط موجود نہ ہوں تو اس حکم پر عمل نہیں کیا جائے گا لیکن جب پھر وہ شرائط یا حالات پیدا ہو جائیں تو اس حکم پر عمل کیا جائے گا۔ مثال کے طور پر قرآن مجید میں ادائے صلوٰۃ کے لئے وضو کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ اس کے ساتھ ہی یہ بھی حکم ہے کہ اگر پانی میسر نہ ہو پھر تیمّم کر لیا کرو۔ اب ظاہر ہے کہ پانی کی موجودگی میں تیمّم والے حکم پر عمل درآمد نہیں کیا جائے گا اور پانی کی عدم دستیابی کی صورت میں وضو کا حکم موقوف رہے گا، وقس علی ہذا۔

(جاری ہے)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

آصف جلیل، کراچی

وحی اور انسانی سوچ

بہت سے افراد کے ذہنوں میں وحی کے متعلق شکوک وشبہات پائے جاتے ہیں ۔ وہ ان کا اظہار ہر کسی سے نہیں کر سکتے اور نہ ہی کسی مولوی صاحب سے اس بارے میں کوئی سوال کر سکتے ہیں کیونکہ وہ جواب دینے کی بجائے کفر کا فتوی صادر کر کے تجدید ایمان اور شادی شدہ کو تجدید نکاح کا مشورہ دیتے ہیں جسے قبول کئے بنا چارہ نہیں ہوتا کیونکہ رہنا تو اسی معاشرے میں ہے۔

وحی کی ماہیت کے بارے میں کسی کو سمجھانا مشکل ہے کیونکہ اس کا تعلق احساسات سے ہے جنہیں الفاظ میں بیان کرنا ممکن ہی نہیں ہوسکتا۔ مثال کے طور پر اگر کسی کو گردے کا درد ہے تو اس کے لئے ناممکن ہے کہ وہ کسی ایسے شخص کو بتا سکے کہ گردے کا درد کیسا ہوتا ہے جسے اس کا تجربہ نہ ہوا ہو۔ یا جس نے کبھی آم نہ کھایا ہو اسے آم کا ذائقہ کے بارے میں بتانا ممکن نہیں ہے۔ وحی کا تعلق صرف انبیاء کرام سے تھا اور اب اس کا سلسلہ منقطع ہو چکا ہے۔ آخری وحی قرآن کریم کی صورت میں ہمارے پاس موجود ہے۔

بعض لوگ وحی کا انکار محض اس لئے کرتے ہیں کہ وہ ان کی سمجھ سے بالاتر ہے۔ حالانکہ بے شمار باتیں ایسی ہیں جنہیں انسان نہیں سمجھ سکتا لیکن وہ ان کا انکار کرنا بھی چاہے تو نہیں کرسکتا۔ مثال کے طور پر اس سوال کا جواب کوئی بھی نہیں دے سکا کہ اتنی بڑی کائنات عدم سے وجود میں کیسے آ گئی؟ کچھ نابغہ قسم کے حضرات اس کی ابتدا (Big Bang) سے کرتے ہیں لیکن اس وقت آتشیں گولا تو موجود تھا۔ اس سے پہلے کی بات نہیں کرتے جب کچھ بھی نہیں تھا۔ انسانی عقل تو اس کا جواب معلوم نہیں کرسکی لیکن انکار اس لئے نہیں ہوسکتا کہ اسی کائنات میں تو ہم زندگی بسر کر رہے ہیں۔ انسانوں کے لئے علم کے ذرائع طبعی عوامل سے وابستہ ہیں، لیکن حیوانات میں جسے جبلت کہا جاتا ہے وہ کہاں سے آ جاتی ہے۔ بطخ کے بچے کو تیرنا کون سکھاتا ہے؟ مرغی کا بچہ کیوں تیرنا نہیں جانتا؟ شہد کی مکھیاں جس طرح اپنا چھتہ تیار کرتی ہیں اور ان کے مختلف گروہ اپنا مخصوص کام کرتے ہیں، یہ سب نظام انہوں نے کہاں سے سیکھا؟ اس کا جواب

قرآن کریم میں ہے کہ ''ہم نے شہد کی مکھیوں کی طرف وحی کی ...... (۱۶:۶۸)۔یعنی وحی علم کا ایک ایسا ذریعہ ہے جسے سمجھنا انسان کے لئے ممکن نہیں۔

اسی طرح کے لاتعداد سوال اور بھی ہیں جن کا ایک جواب عقلیت پسندوں کے پاس ہے کہ یہ نیچر کی طرف سے ہے۔اگر یہ کہا جائے کہ یہ اللہ کی طرف سے ہے تو وہ کہتے ہیں۔اللہ کہاں سے آیا؟ لیکن یہ نہیں بتاتے کہ نیچر کہاں سے آئی؟۔اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ: ''ہم نے انسان کو پیدا کیا ہے اور ہم جانتے ہیں کہ اس کے دل میں کیسے وسوسے اور خیالات آتے ہیں'' (۵۰:۱۶)۔اسی لئے اس نے اپنی ذات کو منوانے کی بات نہیں کی بلکہ اسے ناممکن قرار دے دیا ہے کہ کوئی اس کی مثال بھی دے سکے۔ (۴۲:۱۱) لہٰذا یہ کسی انسان کا مسئلہ ہے ہی نہیں کہ وہ اللہ تعالیٰ کی ذات کے بارے میں جاننے کی کوشش کرے۔پہلے کائنات کا نقطہ آغاز ہی معلوم کر کے دیکھ لے جس کا وہ انکار تو کر نہیں سکتا۔ہم اللہ تعالیٰ کے قوانین قدرت کے بارے میں جان سکتے ہیں اور سائنس دان اسی کام میں مصروف ہیں۔انسانوں کی رہنمائی کے لئے ہدایات قرآن کریم میں آ گئی ہیں۔

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ قرآن کریم نبی کریمﷺ کی اپنی تصنیف ہے (نعوذ باللہ)۔یہ کہنے والوں کا خیال ہے کہ قرآن کریم میں جن امور کا ذکر ہے اگر وہ مملکت سے متعلق ہیں تو ایسے نظریات پہلے سے موجود تھے۔چونکہ حضورﷺ تجارت کے سلسلے میں اکثر سفر کرتے رہتے تھے اس لئے انہیں یہ باتیں معلوم ہو جاتی تھیں۔اور جن امور کا تعلق اس کائنات سے ہے وہ بھی اس وقت نئے نہیں تھے۔مثال کے طور پر قبل از پیدائش کے مراحل کے بارے میں تحقیق ہو چکی تھی۔لیکن جب یہ علوم پڑھائے جاتے ہیں تو ان کے بارے میں یہ بتایا جاتا ہے کہ یہ دو تین صدیوں پرانی بات ہے۔یہ بات سب جانتے ہیں کہ انسانی علم مختلف مراحل سے گزرتا ہوا پھیلتا جا رہا ہے۔اس کی مثال ایک نقطے کے گرد کھینچے گئے دائروں کی سی ہے کہ ہر دائرہ پہلے سے زیادہ وسیع ہو جاتا ہے۔جب تک پہیہ ایجاد نہیں ہوا تھا کوئی مشین بنا ناممکن نہ تھا' جب تک بجلی نہیں بنائی گئی اس وقت تک ان بے شمار اشیاء کا تصور بھی نہیں تھا جو بجلی سے چلتی ہیں۔یعنی علم تدریجی مراحل طے کر رہا ہے۔قرآن کریم میں بہت سے سائنسی حقائق بیان کئے گئے ہیں جو اس وقت کے انسان کے علم سے ماوراء ہیں۔

لیکن ان افراد کے لئے جو کسی بھی دلائل سے مطمئن نہ ہو سکیں' اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے تجرباتی طریق تجویز کیا ہے۔جس طرح کائنات اس کے قوانین کے تابع چل رہی ہے، اسی طرح انسانی معاملات بھی اسی کے قوانین کے تابع ہیں۔یہ کسی بھی انسان کے بس کی بات نہیں ہے کہ وہ ایسے قوانین دے سکے جو تمام انسانوں کے لئے ابدی طور

پر قابل عمل ہوں۔ اگر فرض کرلیا جائے کہ کوئی ایسا کرسکتا ہے تو دوسرے کیوں اس کے دیئے ہوئے قوانین پر عمل کریں؟ یہی سوال کافی ہے اس بات کو ثابت کرنے کے لئے کہ کوئی انسان ایسا نہیں کرسکتا۔ اس لئے قرآن کریم میں جو قوانین آئے ہیں وہ کسی انسان کی طرف سے نہیں ہوسکتے۔ اس کے لئے اللہ تعالیٰ کا کہنا یہ ہے کہ کائنات اس کے قوانین پر عمل پیرا ہے اسی لئے اس میں کوئی خلل نظر نہیں آتا۔ بار بار نظر دوڑانے کے باوجود (۶۷:۳)۔ انسانوں کے لئے قوانین بھی اسی کی طرف سے ہیں جن کے نتائج حتمی ہیں۔ انسان جیسا چاہے عمل کرے لیکن نتیجہ اللہ کے قانون کے تحت ہی نکلے گا۔ اسی لئے تو اس نے اعمال کے نتائج ہی کو اپنی سچائی کا ثبوت قرار دیا ہے۔ اپنی باتوں کو اس نے ''الحق'' قرار دیا ہے۔ انسان اکثر اوقات اپنی جذبات کی پیروی کرتا ہے۔ اس کی عقل اس کے مفادات کے لئے ''منطقی'' دلائل فراہم کرتی ہے۔ ایک جھوٹ ہی کو لے لیں، اس کے لئے کتنے ہی دلائل دیئے جاتے ہیں کہ اگر اپنا فائدہ ہو لیکن کسی کا نقصان نہ ہو تو بول لینا چاہیے۔ یا دو افراد کے درمیان مصالحت کے لئے جھوٹ بولنا جائز ہے۔ ایک عالم دین نے دشمن کی قید میں راز نہ بتانے اور اپنی جان بچانے کے لئے جھوٹ کو واجب بھی قرار دے دیا تھا۔

یہ بات بالکل واضح ہے کہ اگر انسانوں کو قانون بنانے کا اختیار دے دیا جائے تو یہ ہرگز ممکن نہیں ہے کہ وہ ایسا قانون بنا سکیں جس میں ہر فرد کو مساوی حقوق حاصل ہوں۔ آج تک تو انسانوں نے جس طرح حکمرانی کی ہے اس میں اکثریتی طبقے کو ہمیشہ نہ صرف نظرانداز کیا گیا بلکہ ظلم کی ایسی داستانیں رقم کی گئی ہیں کہ درندے بھی شرما جائیں۔ (اللہ کے قوانین پر مبنی حکومتیں اس سے مستثنیٰ ہیں)۔ علاوہ ازیں ان امور پر بھی جو طبعی قوانین سے متعلق ہیں ان کے بارے میں بھی چند افراد کا متفق ہونا مشکل نظر آتا ہے۔ مثال کے طور پر اگر گھر میں کسی کو بخار ہو اور گھر والے اس کا بخار چیک کریں تو کوئی کہے گا کہ ہلکا سا بخار ہے۔ دوسرا کہے گا نہیں یہ تو تپ رہا ہے۔ تیسرا کہے گا کہ ۱۰۱ کے قریب ہے۔ لیکن اللہ کے قانون کے مطابق بنایا ہوا آلہ (تھرمومیٹر) بالکل صحیح طور پر بتا دے گا کہ کتنا بخار ہے۔ اسی طرح انسان کی ایک اور کمزوری سامنے آئی کہ وہ ظن وقیاس سے کام لیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ اکثر لوگ ظن کا اتباع کرتے لیکن حق کے مقابلے میں ظن ٹھہر نہیں سکتا (۱۰:۳۶)۔ ایک غلط فہمی انسان کو یہ بھی ہے کہ وہ ہر بات جان سکتا ہے حالانکہ اللہ تعالیٰ نے کہا ہے کہ تمہیں تھوڑا علم دیا گیا ہے۔ (۱۷:۸۵)۔ جیسے جیسے علم کا دائرہ وسیع ہوتا جا رہا ہے ایک فرد کے علم کا تناسب کم سے کم ہوتا جا رہا ہے۔ آج اتنے علوم منظر عام پر آ گئے ہیں کہ کسی کے لئے یہ ممکن ہی نہیں رہا کہ وہ ان سب کا احاطہ کر سکے۔

جو ممالک علمی میدان میں آگے ہیں اور اپنے

نظامِ مملکت کو خوب سے خوب تر بنانے میں مصروف ہیں وہ انہیں اصولوں پر پہنچ رہے ہیں جو قرآن کریم نے بیان کئے ہیں۔ اگر تجربات کی بجائے براہ راست قرآن کریم سے رہنمائی لے لی جائے تو بہت سا وقت بچ جاتا ہے اور متعدد مشکلات کا سامنا نہیں کرنا پڑتا۔ جو ممالک اسلامی کہلاتے ہیں وہاں قرآن کریم کو محض ثواب کی خاطر پڑھا جاتا ہے۔ وہ اسلام کو بطور مذہب پیش کرتے ہیں اور اسی پر عمل پیرا ہیں۔ فی الحال اسلام کو بطور نظامِ مملکت نہ ان ممالک کے عوام قبول کرنے کو تیار ہیں اور حکمرانوں کے لئے یہ موت کا پیغام ہے۔ اس فضا میں قرآن کریم کے بارے میں شکوک عام ہو رہے ہیں جنہیں دور کرنا ان افراد کی ذمہ داری ہے جو قرآنی تعلیمات کو سمجھ چکے ہیں۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

آغازِ سخن

قارئین اس امر سے بخوبی واقف ہوں گے کہ خدا تعالیٰ کے فضل وکرم سے بزمِ طلوعِ اسلام لاہور نے جناب علامہ غلام احمد پرویزؒ کے دروسِ قرآن پر مشتمل قرآنی تفسیر ویڈیو آڈیو سی ڈی پر سے قرطاس پر منتقل کرنے کا جو پروگرام اکتوبر 2003ء میں شروع کیا تھا اس وقت تک اس تفسیر کی 9 جلدیں سورۂ نحل سے سورۂ حج تک پھر 29' 30 پارہ مکمل اور اس کے بعد سورۃ فاتحہ کتابی شکل میں شائع ہو چکی ہے جب کہ اس وقت اسی سلسلہ کی دسویں جلد سورۃ النور طالبانِ قرآن کی خدمت میں پیش کی جارہی ہے۔

ہمارا خیال ہے کہ نوعِ انسانی کی معاشرتی زندگی پر جنسیاتی بے راہ روی کے اثرات جیسے نہایت اہم ترین موضوعات کے علاوہ زیرِ نظر سورۃ النور کی آیت نمبر 35 کی جو تفسیر زیرِ نظر دروس میں بیان کی گئی ہے اس کا عمیق نظر سے مطالعہ یقیناً قرآن فہمی کے سلسلہ میں مفید ثابت ہوگا۔ چنانچہ اس سلسلہ میں مذکورہ آیت کے متعلق تمام مروجہ تراجم کے علاوہ علامہ پرویزؒ نے وحدت الوجودی تصورات کی اصل حقیقت کو نہایت واضح تر انداز میں بے نقاب کر دیا ہے۔ نتیجہ یہ کہ ان تصورات کی اس وضاحت سے جہاں حضرت انسان کو اس محیر العقول کائنات کے اندر اپنے مقامِ بلند کا اندازہ ہوگا وہاں اس کی وساطت سے عقل انسانی کو جب قندیل آسمانی کی اہمیت اور اس کی قدر و منزلت سے آگاہی حاصل ہوگی' تو علامہ اقبال کے الفاظ میں وہ بے ساختہ پکار اٹھے گی کہ

عقل بے مایہ امامت کی سزاوار نہیں
راہبر ہو ظن و تخمیں تو زبوں کارِ حیات

چنانچہ علامہ پرویزؒ نے سورۃ النور کی آیت نمبر 35 کے سلسلہ میں مفہوم القرآن کے تعارف میں بڑی تفصیل کے ساتھ اس امر کی یہ بھی وضاحت کی ہے کہ قرآنی الفاظ کا ترجمہ کسی زبان میں بھی ممکن نہیں لہٰذا آپ تحریر کرتے ہیں کہ:

ترجمہ مفہوم کو واضح کر ہی نہیں سکتا

''حقیقت یہ ہے کہ قرآن کریم کا ترجمہ' خواہ وہ دنیا کی کسی زبان میں بھی کیوں نہ ہو' قرآنی مفہوم کو واضح کر ہی نہیں سکتا۔ حتیٰ کہ اگر قرآنِ کریم کے الفاظ کی جگہ' خود عربی زبان کے دوسرے الفاظ رکھ دیئے جائیں تو بھی بات کچھ سے کچھ ہو جائے گی۔ قرآنِ کریم کا انداز اور اسلوب بالکل نرالا ہے۔ یہ اپنی مثال آپ ہے الفاظ تو

اس کے عربی زبان ہی کے ہیں' لیکن ان میں جامعیت اس قدر ہے کہ نہ ان الفاظ کی جگہ دوسرے الفاظ لے سکتے ہیں اور نہ ہی ان کی ترتیب میں ردوبدل کرنے سے' وہ بات باقی رہ سکتی ہے۔ اس لئے قرآنِ کریم کے ترجمہ میں اس کا پورا پورا مفہوم آ نہیں سکتا۔''

امام ابن قتیبہ کی رائے

اس باب میں امام ابن قتیبہؒ (متوفی 277ھ) کتاب القرطین میں عربوں کے مختلف اسالیب بیان کی خصوصیات کا ذکر کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

قرآنِ کریم کا نزول' ان تمام اسالیب کلام کے مطابق ہوا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کوئی ترجمہ کرنے والا' قرآنِ کریم کا ترجمہ کسی زبان میں (کما حقہ) نہیں کرسکتا' جیسا کہ ترجمہ کرنے والوں نے انجیل کا ترجمہ سریانی زبان سے' حبشی یا رومی زبان میں کرلیا تھا' ایسے ہی زبور اور تورات کے تراجم اور باقی کتب الٰہیہ کے تراجم عربی زبان میں کرلیے گئے تھے۔ کیونکہ عجمی زبانوں میں' مجاز کی وہ وسعت نہیں جو عربی زبان میں ہے۔ مثال کے طور پر دیکھئے کہ اگر آپ قرآنِ کریم کی اس آیت کا ترجمہ کرنا چاہیں۔''

واما تخافن من قوم خیانۃ فانبذ الیھم علیٰ سوآء۔ (8:58)

تو آپ قیامت تک ایسے الفاظ مہیا نہیں کرسکتے جو ان معنوں کو ادا کردیں جو اس آیت میں ودیعت ہیں' بجز اس کے کہ آپ اس نظم و ترتیب کو توڑ کر الگ الگ چیزوں کو ملائیں اور جو چیزیں اس میں ودیعت کی گئی تھیں انہیں اس طرح ظاہر کردیں اور یوں کہیں کہ ''اگر تمہارے درمیان اور کسی قوم کے درمیان صلح اور معاہدہ ہو' اور تمہیں ان سے خیانت اور نقضِ عہد کا اندیشہ ہو' تو پہلے انہیں بتادو کہ جو شرائط تم نے ان کے لئے منظور کی تھیں تم نے انہیں توڑ دیا ہے' اور اس کے ساتھ ہی ان کے خلاف اعلانِ جنگ بھی کردو تاکہ تم اور وہ دونوں نقضِ عہد کو جان لینے میں برابر برابر ہوجاؤ۔''

ایسے ہی قرآن کریم کی ایک دوسری آیت ہے:

فضربنا علیٰ اٰذانھم فی الکھف سنین عددا۔ (18:11)

اگر آپ چاہیں کہ اس مضمون کو کسی دوسری زبان کے الفاظ میں منتقل کردیں تو اس سے وہ مضمون قطعاً نہیں سمجھا جاسکے گا جو ان الفاظ سے سمجھا جاتا ہے اور اگر آپ یہ کہیں کہ اس کا ترجمہ یہ ہے کہ ''ہم نے انہیں چند سال تک سلائے رکھا'' تو اب بھی آپ نے

مضمون کا ترجمہ تو کر دیا' مگر الفاظ کا ترجمہ نہیں کر سکے۔

ایسے ہی قرآن کریم کی تیسری آیت ہے:

والذین اذا ذکروا بأیٰت ربھم لم یخروا علیھا صما و عمیانا۔ (25:73)

اگر آپ اس آیت کا ترجمہ اس کے الفاظ کے مطابق کریں گے تو وہ ایک مغلق بات بن جائے گی اور اگر آپ یوں کہیں گے کہ ''وہ لوگ اس سے تغافل نہیں برتتے'' تو اس سے آپ نے مضمون کو دوسرے الفاظ میں ادا کر دیا ہے' ترجمہ نہیں کیا۔

(قرطین' جلد دوم' ص163)۔

ایک مستشرق کی رائے

یہ تو اپنوں کی رائے ہے غیروں میں سے بھی جس نے قرآنِ کریم کا مطالعہ بنظر غائر کیا ہے' وہ اسی نتیجہ پر پہنچا ہے کہ قرآنِ کریم کا ترجمہ (کماحقہٗ) کسی زبان میں نہیں ہو سکتا۔ مشہور مستشرق گب (H.A.R Gibb)' اپنی کتاب (Modern Trends in Islam _ 1945 ed) میں لکھتا ہے:

''حقیقت یہ ہے کہ قرآنِ کریم کا ترجمہ ہو ہی نہیں سکتا۔ جس طرح کسی بلند شاعری کا ترجمہ نہیں ہو سکتا۔ وحی کی زبان ہی مختلف ہوتی ہے قرآنِ کریم کا انگریزی زبان میں ترجمہ کرو تو اس سے زیادہ کیا ہو گا کہ اس کے عربی زبان کے تراشے ہوئے نگینوں کے گوشوں کو جامع طور پر سامنے لانے کے بجائے مترجم اپنے وضع کردہ ایسے الفاظ استعمال کرے گا جو اصلی الفاظ کی وسعت اور جامعیت کو مقید کر دیں گے۔ ایسی آیات میں' جن میں عام واقعات یا قوانین واحکام مذکور ہوں' ترجمہ کا یہ نقص شاید زیادہ نقصان رساں نہ ہو' لیکن بایں ہمہ' جو مدوجزر' جو نشیب وفراز' جو بلندیاں اور گہرائیاں' جو لطافتیں اور باریکیاں اور اس کے ساتھ جو جوش وخروش' اصل کتاب میں جلوہ فرما ہے وہ ترجمہ میں کیا آ سکے گا! ذرا اس صاف اور سیدھی سی آیت کو لیجئے:

انا نحن نحي و نميت والينا المصير۔ (50:43)

اور انگریزی ہی نہیں' دنیا کی کسی زبان میں اس کا ترجمہ کر کے دکھایئے۔ اس کے چھ الفاظ میں' جو پانچ مرتبہ ''ہم'' (We) کی تکرار ہے' اسے کون سی زبان ادا کر سکے گی؟

چنانچہ محترم پرویز صاحب سورۂ نور کی آیت نمبر 35 کے سلسلہ میں تحریر کرتے ہیں کہ:

اس آیت کا ''مفہوم القرآن'' میں مفہوم

میں نے ''مفہوم القرآن'' میں اس کا جو مفہوم دیا ہے اسے اب میں ان الفاظ میں بیان کرتا ہوں۔ ''خدا نے ہر شے کو پیدا کیا

ہے اور اسے اس راستے پر چلنے کے لئے راہنمائی دی جو اس کے لئے مقرر کیا گیا تھا (20:51) اور یہی وہ خدا کا نور ہے جو ہر جگہ پھیلا ہوا ہے۔ اشیائے کائنات میں یہ ہدایت ان کی پیدائش کے ساتھ' ان کے اندر ودیعت کر کے رکھ دی گئی ہے لیکن انسانوں کو یہ راہنمائی کتاب کی شکل میں دی گئی ہے۔ خدا کی مشعلِ ہدایت (وحی) کی مثال یوں سمجھو' جیسے کسی طاق میں' جو پیچھے سے بند ہو' اس لیے محفوظ اور سامنے سے کھلا ہو' جس سے روشنی ساری فضا میں پھیل جائے' ایک جگمگاتا چراغ ہو' ایسا ٹھنڈی اور صاف روشنی دینے والا چراغ' جیسے ستارۂ صبحگاہی فضا کی تاریکیوں میں نور پاش ہو' اور اس چراغ کو ایک صاف اور شفاف شیشے کے فانوس میں رکھ دیا گیا ہو' تا کہ وہ تمام خارجی اثرات سے محفوظ رہے۔ (41:42) خود فانوس بھی ایسا درخشندہ گویا وہ چمکتا ہوا تارہ ہے جس سے نور کی ندیاں رواں ہیں۔ وہ چراغ ایک ایسے بابرکت شجر کے تیل سے روشن ہو جو مشرق اور مغرب کی نسبتوں سے بلند' تمام نوع انسان کے لئے یکساں ہو۔ ایسا تیل جو اس کا محتاج نہ ہو کہ کوئی خارجی روشنی اسے جلائے۔ وہ اپنے آپ روشن ہو اور دوسروں کو بھی روشنی دے۔ وہ اپنے معانی اور تفسیر کے لئے خارجی امداد کا محتاج نہ ہو۔ وہ چراغ نہیں' روشنی کی تہیں ہیں جو ایک کے اوپر دوسری' تو بر تو' چڑھی ہوئی ہیں۔ وہ سارے کا سارا نور ہے۔ نورِ مجسم ہے۔ اس میں روشنی ہی روشنی ہے۔ گوہر میں آب گوہر کے سوا کچھ اور نہیں۔ اس کے سوا کچھ نہیں۔

''یہ ہے خدا کا وہ نور (وحی) جس کی طرف وہ ہر اس شخص کی راہنمائی کرتا ہے جو اس سے راہنمائی لینا چاہے۔ اللہ مجرد حقیقتوں کو اس قسم کی محسوس مثالوں کے ذریعے اس لئے بیان کرتا ہے تا کہ لوگ بات اچھی طرح سمجھ لیں۔ یہ مثالیں اس خدا کی طرف سے دی جاتی ہیں جو جانتا ہے کہ حقیقت کیا ہے اور اسے کس قسم کی مثالوں سے واضح کرنا چاہئے۔''

ہمیں امید ہے کہ قارئین کو زیرِ نظر قرآنی تفسیر کے صفحات میں جا بجا بکھرے ہوئے حقائق کی ضیاء پاشیوں اور حیاتِ نو کی جلوہ ریزیوں سے استفادہ کا موقع میسر آئے گا۔

آخر پر ہم ان تمام محسنوں کے تہہ دل سے شکر گزار ہیں کہ جن کے تعاون سے قرآنِ حکیم کی یہ تفسیر بتدریج اپنے مختلف مراحل سے گزرتی ہوئی جانب منزل رواں دواں ہے۔

آسماں ہو گا سحر کے نور سے آئینہ پوش
اور ظلمت رات کی سیماب پا ہو جائے گی (اقبالؒ)

احباب کے مخلصانہ تعاون اور مومنانہ رفاقت کی طلب گار

بزم طلوعِ اسلام' لاہور

یکم جون 2007ء

☆☆☆☆☆☆☆☆☆

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

قرآن۔۔۔غیروں کی نظر میں

(آخری قسط)

قرآن بساط سے زیادہ بوجھ نہیں ڈالتا

مسٹر چیننگ پولک Mr. Channing Pollock اپنی تالیف ''دی اینی می'' The Enemy کے صفحہ ۹۶۔۹۷ میں لکھتے ہیں:

''شاید ہمارے مذہب (عیسائیت) میں خرابی یہ ہے کہ وہ فطرت انسانی پر اس کی بساط سے بڑھ کر بوجھ ڈالتا ہے۔ اگر تم ایک آدمی سے کہو کہ تمہاری صحت اعتدال کے ساتھ کھانے پر موقوف ہے۔ تو اغلب ہے کہ وہ اس کی کوشش کرے۔ لیکن اگر تم اس سے یہ مطالبہ کرو کہ ''کچھ بھی نہ کھاؤ''۔ تو وہ یقیناً کہے گا۔ ''بات تو اچھی ہے لیکن غیر ممکن ہے۔'' قرآن فطرت انسانی پر بہت کم بوجھ ڈالتا ہے۔ اس لئے اس کی اطاعت کی جاتی ہے۔''

قرآن مغرب کے گوشے گوشے میں پڑھا جانا چاہئے

سر ایڈورڈ ڈینیسن راس سی آئی ای نے سیل کے ترجمہ قرآن کے آخری ایڈیشن (مطبوعہ ۱۹۲۲ء) پر جو مقدمہ لکھا ہے۔ اس میں تحریر کیا ہے:

''تیرہ سو سال کے تمام انقلابات کے دوران میں قرآن (کریم) تمام ترکوں' ایرانیوں اور ہندوستانیوں کی تقریباً ربع آبادی کا صحیفۂ مقدس رہا ہے۔'' اور وہ اس بات پر زور دیتے ہیں کہ ''یقیناً ایسی کتاب جیسی کہ قرآن (کریم) ہے۔ اس امر کی مستحق ہے کہ مغرب کے گوشے گوشے میں پڑھی جائے۔ خصوصاً دورِ حاضر میں جبکہ موجودہ ایجادوں کے ذریعے زمان و مکان کی بندشیں بالکل محو ہوگئی ہیں اور جب کہ مفاد عامہ تمام دنیا کو اپنی آغوش میں لئے ہوئے ہے۔''

قرآن کا مقصد توحید الٰہی ہے

ڈاکٹر جارٹن ''ورلڈز پراگرس'' (ترقی عالم) کے صفحہ ۳۸۷ میں لکھتے ہیں:

''قرآن کا مقصد عظیم بعض قوانین و رسوم کے

ماتحت بت پرستوں، یہودیوں اور عیسائیوں کو ایک خدا کی (جس کی وحدانیت اس کا نقطۂ کمال تھا) پرستش پر مائل ومتفق کرنا ہے۔ وہ قریش کی عربی زبان میں لکھا گیا تھا اور یہ زبان جو سچ مچ ہر ایک وصفِ حسنہ رکھتی ہے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ جنت الفردوس کی زبان ہے......قرآن کریم کا طرزِ تحریر دلآویز۔ رواں اور جہاں کہیں خدا کے جاہ وجلال اور اوصاف کا ذکر آیا ہے۔ شاندار اور بلند ہے۔ محمد ﷺ، حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ کی نبوت کے قائل تھے۔''

قرآن نہایت آسانی سے سمجھ میں آسکتا ہے

مسٹر سی۔ ایف رائڈر نے ''اسلام اور عیسائیت'' کا باہمی مقابلہ کرتے ہوئے ایک جلسہ میں جو بمقام لندن جولائی ۱۹۱۶ء میں زیرِ صدارت مسٹر عبداللہ یوسف علی منعقد ہوا تھا۔ کہا تھا:

''اس ملک (انگلستان) کے پیشوایانِ دین اس حقیقت پرغم کے آنسو بہایا کرتے ہیں کہ افریقہ میں اسلام بہ نسبت عیسائیت کے زیادہ سرعت کے ساتھ پھیل رہا ہے۔ شاید وہ اس امر سے آگاہ نہیں ہیں کہ اس سرعتِ رفتار کی وجہ اس کی سادگی میں مضمر ہے۔ کیونکہ عقائد اسلام عیسائیت کی نسبت بہت کم پیچیدہ ہیں۔ اس نے جو ضابطہ (قرآن) حیاتِ انسانی کی راہنمائی کے لئے بنی نوعِ انسان کو عطا کیا ہے وہ نہایت آسانی سے سمجھ میں آسکتا ہے اور یہی ایک بڑی وجہ افریقہ میں اس کی سبک رفتاری کی ہے۔''

قرآن میں ایک وسیع جمہوریہ کے تمام آئین موجود ہیں

لڈن کرہل اپنی کتاب ''دی لیبن دی محمدؐ'' Des Leben des Muhammad. میں جو بمقام لپسہ ۱۸۸۴ء میں شائع ہوئی، لکھتے ہیں:

''قرآن عقائد واخلاق اور نیز ان پر مبنی قانون کا ایک مکمل ضابطہ پیش کرتا ہے۔ اس میں ایک وسیع جمہوریہ کے تمام آئین واصول کے لئے رشد وہدایت کے لئے، انصاف وعدالت کے لئے، فوجی تنظیم وترتیب کے لئے، مالیات کے لئے، غربا کے متعلق نہایت محتاط قانون سازی کے لئے۔ بنیادیں رکھی گئی ہیں لیکن ان تمام کا سنگِ بنیاد ذاتِ باری کا اعتقاد ہے۔ جس کے قبضۂ قدرت میں انسان کی قسمتوں کی باگ ہے۔''

قرآن مذہب اور علم کے درمیان اتحاد کی تلقین کرتا ہے

مشہور جرمن مستشرق ہورٹن اپنی کتاب

''استعداد الاسلام بقول الثقافۃ الروحیہ'' میں لکھتا ہے:

''تم اسلام کو ایسا مذہب پاؤ گے جس میں مذہب اور علم کے درمیان اتحاد ہے۔ یہی ایک ایسا دین ہے جو دونوں کو ایک کئے ہوئے ہے۔ اگر تم غور کرو گے تو تم کو مذہب اسلام عقل کے مطابق نظر آئے گا اور تم ایک فقیہ کو فلسفی کے ساتھ معانقہ کرتے ہوئے پاؤ گے۔ (ص ۹)۔

قرون وسطیٰ تقریباً ۱۵۱۰ء کا مشہور فلسفی ابن رشد پکا مسلمان تھا۔ جو قرآن کے ہر ہر لفظ پر اعتقاد رکھتا تھا۔ مگر باوصف اس کے اس کا مذہب' اس کا عقیدہ اور وہ قرآن جس کو اس نے اپنا متمسک بنایا تھا۔ یونانی فلسفہ کے مطالعہ اور ارسطو کے آثار و علوم کے حاصل کرنے سے مانع نہیں تھا۔'' (ص ۱۰)

قرآن قدیم وجدید صداقتوں کا مظہر ہے

ہر ہائی نس شہزادی خیر النساء۔ ڈیانگ موڈا۔ جزیرہ سراوک جنہوں نے ہوائی جہاز میں اسلام قبول کیا تھا۔ لکھتی ہیں:

''قرآن میں تاریخ قدیم اور خدا کی وحدانیت کی عظیم الشان صداقتیں موجود ہیں۔...... اس مادیت اور دہریت کے زمانہ میں رسول پاک ﷺ کے کلمات برابر دلوں میں گھر بناتے جا رہے ہیں۔ اسلام کے خلاف رومن کیتھولک فرقہ کی شدید جدوجہد کے باوجود وہ دن دور نہیں جب ارشاداتِ نبوی یورپ میں بھی اسی طرح عام ہو جائیں گے۔ جس طرح کہ مشرق میں ہیں۔ قرآن میں موجودہ زمانہ کی عظیم صداقتوں اور بائبل' مسیح' کنفوشس اور ویدوں کی دانش آموزیوں کی گونج سنائی دے رہی ہے۔ یہ محیر العقول کتاب تسلی' امید اور محبت کی دولت سے مالا مال ہے۔''

(اخبار لائٹ' لاہور)۔

قرآن ایک زبردست دعوتِ عمل ہے

ڈاکٹر جارج۔ ایس۔ ارنڈیل پریذیڈنٹ تھیوسافیکل سوسائٹی رقمطراز ہیں۔ (ٹروتھ۔ لاہور۔ یکم جولائی ۱۹۳۵ء)۔

''حضرت محمد ﷺ کی تعریف تحصیلِ حاصل ہے۔ ان کی ساری زندگی عظمت و بزرگی کے تابناک نشانات سے درخشندہ تھی اور ایک نہایت خوشنما' نہایت گہری اور نہایت سادہ روحانیت ان کا طغرائے امتیاز تھی۔ حضرت محمد لازمی طور پر ایک نبی تھے۔ اس لئے کہ ان کو اپنی صدا ایک وحشت ناک ویرانے میں بلند کرنا پڑی۔ قرآن کی عظمت محض اس کے کتاب ہونے میں مضمر نہیں ہے بلکہ اس حقیقت میں مخفی ہے کہ وہ آنے والی نسلوں کے

لئے ایک زبردست دعوت عمل ہے جو شاندار اسلامی تمدن اور حکومت دنیا میں قائم کرنے والی ہیں۔''

قرآن دنیا کے لئے امن واتحاد کا پیغام لایا ہے

ہندی زبان کے بے مثال اور کثیر الاشاعت رسالہ ''چاند'' کے ایڈیٹر منشی کنہیا لال ایڈووکیٹ اپنے رسالہ میں لکھتے ہیں:

''رمضان کا مہینہ مسلمانوں کی آسمانی کتاب کے نزول کا زمانہ ہے۔ یہ وہ کتاب ہے جس کی عظمت کا راز اس کی پاکیزہ تعلیم میں پوشیدہ ہے۔ قرآن کریم دنیا کے لئے امن و اتحاد کا پیام ہے۔ اصلاح اور صلاح کا ضابطہ ہے۔ اس کی خوبیاں اسی وقت معلوم ہوسکتی ہیں جب کہ اس پر عقیدہ رکھنے والے اس کے احکام پر پوری طرح عمل کریں اور اپنے آپ کو نمونہ بنا کر دکھا دیں کہ مسلمان ایسے ہوتے ہیں............ جس کتاب نے کسی زمانہ میں ایک زبردست قوم بنا کر دکھائی وہ کبھی بیکار اور غیر مفید نہیں ہوسکتی۔''

قرآن ایک مستقل اور زندہ معجزہ ہے

مسٹر سی۔اے سورما بی۔اے جو قرآن کے مطالعہ کے بعد اسلام لے آئے' ایک طویل مضمون میں لکھتے ہیں:

''قرآن رسول خدا (ﷺ) کے ذریعہ جس صورت میں نازل ہوا۔ اسی صورت میں موجود ہے۔ ایک شوشہ تک کا فرق نہیں آیا۔ انسانی ہاتھ اور دماغ نے اس میں کوئی دخل نہیں دیا۔ اور یہ ایک ایسی بات ہے جو کلی بلکہ جزوی طور پر بھی کسی مذہبی کتاب کے متعلق نہیں کہی جاسکتی۔ (حضرت) محمد ﷺ کا دعویٰ تھا کہ وہ ایک مستقل اور زندہ معجزہ ہے اور حقیقت میں وہ ایک معجزہ ہی ہے۔''

قرآن ہی قابل قبول اور اطمینانِ قلب کی کتاب ہے

حضرت بابا نانکؒ فرماتے ہیں:

توریت۔زبور۔انجیل۔ترے پڑھ سُن ڈٹھے وید
رہی قرآن کتاب کل جگ میں پروار

(جنم ساکھی کلاں' ص ۱۴۷)

(توریت۔زبور۔انجیل اور وید وغیرہ تمام پڑھ کر دیکھ لئے۔قرآن شریف ہی قابل قبول اور اطمینان قلب کی کتاب نظر آئی)۔

رہی کتاب ایمان دی سچ کتاب قرآن

اگر سچ پوچھو تو سچی اور ایمان کی کتاب۔ جس کی ملاقات سے دل باغ باغ ہو جاتا ہے۔ قرآن شریف ہی

ہے)۔

قرآن ژند اوستا کے مقابلہ میں

پروفیسر ایڈورڈ جی براؤن ایم۔اے۔ ایم۔بی۔ اپنی تالیف ''اے لٹریری ہسٹری آف پرشیا'' (تاریخ ادبیات ایران) میں ژند اوستا اور قرآن کا مقابلہ کرتے ہوئے ص۱۰۲ میں لکھتے ہیں:

''میں جوں جوں قرآن پر غور کرتا اور اس کے مفہوم اور معانی کو سمجھنے کی کوشش کرتا ہوں۔ میرے دل میں اس کی قدر ومنزلت زیادہ ہوتی جاتی ہے لیکن ژند اوستا کا مطالعہ بجز ایسی حالتوں کے کہ اس کو علمِ اوثان یا تحقیقِ لسانی یا اسی قسم کے دیگر اغراض کے لئے پڑھا جائے۔ طبیعت میں تکان پیدا کرتا اور بار خاطر ہو جاتا ہے۔''

قرآن کی آیات دینی اور اخلاقی خیالات پر مشتمل ہیں

انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا کی جلد ۱۶ صفحہ ۵۹۹ میں لکھا ہے:

''قرآن کے بہت سی آیات دینی و اخلاقی خیالات پر مشتمل ہیں۔ مظاہر قدرت۔ تاریخ۔ الہاماتِ انبیا کے ذریعہ اس میں خدا کی عظمت، مہربانی اور صداقت کی یاد دلائی گئی ہے۔ بالخصوص حضرت محمد ﷺ کے واسطہ سے خدا کو واحد اور قادر مطلق ظاہر کیا گیا ہے۔ بت پرستی اور مخلوقات کی پرستش کو (جیسا کہ جناب مسیح کو خدا کا بیٹا سمجھ کر پوجا جاتا ہے) بلالحاظ ناجائز قرار دیا گیا ہے............ قرآن کی نسبت یہ بالکل بجا کہا جاتا ہے کہ وہ دنیا بھر کی موجودہ کتابوں میں سب سے زیادہ پڑھا جاتا ہے۔''

قرآن خود اپنی تعظیم کراتا ہے

مسٹر وڈول جس نے قرآن کا ترجمہ شائع کیا۔ لکھتا ہے:

''جتنا بھی ہم اس کتاب (قرآن) کو الٹ پلٹ کر دیکھتے ہیں۔ اسی قدر پہلے مطالعہ میں اس کی نامرغوبی نئے نئے پہلوؤں سے اپنا رنگ جماتی ہے۔ لیکن فوراً ہمیں مسخر کر لیتی، متحیر بنا دیتی اور آخر میں ہم سے تعظیم کرا کے چھوڑتی ہے۔ اس کا طرزِ بیان باعتبار اس کے مضامین و اغراض کے عفیف، عالیشان اور تہدید آمیز ہے اور جا بجا اس کے مضامین سخن کی غایت رفعت تک پہنچ جاتے ہیں۔ غرض یہ کتاب ہر زمانہ میں اپنا پرزور اثر دکھاتی رہے گی۔''

قرآن کا کمالِ عبارت وشانِ تخیل

موسیو سیواری جنہوں نے قرآن کا فرانسیسی زبان میں ترجمہ کیا ہے۔ موسیو ڈورائر کے ترجمہ پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اگر قرآن جو تمام ایشائی ممالک میں عبارت کے کمال اور قوتِ خیال کے علوِ شان وعظمت وجلال کے اعلیٰ مرتبہ پر ہے ڈورائر کے ترجمہ میں ایک غیر مرتب اور سست وبے مزہ بیان کہ جس سے طبیعت دِق ہو جائے معلوم ہوتو یہ الزام اس طرز ادا پر لگانا واجب ہے جو ڈورائر نے اس ترجمہ میں اختیار کی ہے۔''

قرآن اسلام کی مظفر ومنصور فوجوں کے ساتھ ساتھ گیا

مسٹر روبن سن تحریر فرماتے ہیں:

''اہل اسلام کی مظفر ومنصور فوجوں نے خواہ ملک شام کو فتح کیا یا شمالی افریقہ میں علم تسخیر بلند کیا یا بحیرہ احمر کو عبور کر کے بحیرہ اسود میں پاؤں جمائے۔ الغرض وہ جہاں کہیں بھی پہنچیں۔ قرآن کی تعلیم ان کے ساتھ ساتھ گئی۔ جس کی وجہ سے انہوں نے کسی جگہ جور وظلم کا ارتکاب نہیں کیا۔ کسی قوم کو انہوں نے اس بنا پر تہ تیغ نہیں کیا کہ وہ اسلام قبول کرنے سے انکار کرتی تھی۔''

قرآن توحید سکھاتا ہے

سر جان ملکم آنجہانی سابق سفیر ایران وگورنر بمبئی اپنی ''تاریخ ایران'' میں لکھتے ہیں:

''ہیچ چیز عالی تر ونکوتر از عقیدہ اہل اسلام در توحید نمی شود ازاں رو کہ از ہر طرف رو بہ یکے دارند۔ چنانچہ از آیات واخبار وآثار واشعار واقوال شاں ہمہ ظاہر است اینما تولوا فثم وجہ اللہ (ہر جا کہ نظر کردم سیمائے تو می بینم) او تعالیٰ را مخصوص وشائستہ بندگی می دانند وبس۔ ہیچ کس را از مخلوقات دریں باب باوے شریک وسہیم نمی سازند۔''

قرآن زندگی کے طبعی لازمات کو پورا کرتا ہے

مسٹر اے۔ آر۔ واڈیا Mr. A.R. Wadia پروفیسر آف فلاسفی میسور یونیورسٹی نے ۲۵ جولائی ۱۹۳۶ء کو ٹریننگ کالج کی ٹیچرز ایسوسی ایشن کے جلسہ عید میلاد میں تقریر کرتے ہوئے کہا:

''اسلام کو صحیح طور پر سمجھنے کے لئے قرآن اور اس کے صادق پیرووٴں کے اعمال کا مطالعہ ضروری ہے۔ اگر آج مجھ سے دریافت کیا جائے کہ وہ کون سا مذہب ہے جو زندگی کے طبعی لازمات و مطالبات کو پورا کرتا ہے۔ تو میں اولیں جگہ اسلام کو

دوں گا۔''

(دکن ٹائمز۔مطبوعہ ۱۲ اگست ۱۹۳۶ء)

قرآن زبردست وحدانیت کا علمبردار ہے

مسٹر ڈبلیو۔بی بشیر پکرڈ W.B.Bashyr Pickard جنہوں نے مطالعہ قرآن کے بعد اسلام قبول کیا۔لکھتے ہیں:

''قرآن آج بھی ویسا ہی موجود ہے' کسی نے اس میں تحریف نہیں کی۔وہ محفوظ ہے۔اس میں کچھ تغیر نہیں ہوا۔وہ خالص اور پاکیزہ ہے اور ایک نہ ختم ہونے والی رحمت خداوندی ہے۔عملی مذہب میں وہ ایک زبردست وحدانیت کا علمبردار ہے۔ایک خدا' ایک خدا اور ایک برادری۔''

قرآن عمل کے لئے روشنی کا مینار ہے

یہی مصنف ''اسلام کی خوبیاں'' کے ذیل میں لکھتا ہے:

''قرآن عمل کے لئے ایک روشنی کا مینار ہے' رہنما ہے اور ایک سند ہے۔وہ عہد حاضر کی عملی زندگی سے دارالبقا کی طرف راہنمائی کرتا ہے۔وہ ایک مکمل ضابطہ ہے۔جس میں کسی قسم کا ردوبدل نہیں ہوا۔''

(اسلامک ریویو۔جنوری ۱۹۳۶ء)

قرآن ایک ناقابل تشریح طلسم ہے

ای۔ڈبلیو بلائیڈن ایل۔ایل۔ڈی جو ایک حبشی عیسائی ہے' اپنی تالیف ''عیسائیت' اسلام اور حبشی نسل'' میں لکھتا ہے:

''جہاں خیالات ان حبشیوں کی سمجھ میں نہیں آتے۔وہاں قرآن مجید کے الفاظ بھی ان کے لئے ایک ایسی ناقابل بیان خوبصورتی اور موسیقی اور ایک ناقابل تشریح طلسم بن جاتے ہیں جو محض السنہ مغربیہ کے جاننے والوں کے لئے قطعاً ناقابل فہم ہے۔''

قرآن عربی زبان کا معیار حقیقی پیش کرتا ہے

جارج ای پٹنم ممبر امریکن اتھنالوجیکل سوسائٹی ونیو یارک ہسٹوریکل سوسائٹی ''ورلڈز پراگرس'' کے صفحہ ۱۶۰ میں لکھتے ہیں:

''یہ کتاب (قرآن) جو الہامات و اعتقادات محمد ﷺ پر مشتمل ہے۔مسلمہ طور پر عربی زبان کا معیار حقیقی پیش کرتی ہے اور جیسا کہ مسلمانوں کا عقیدہ ہے۔انسانی قلم اس کی تقلید سے قاصر ہے اس لئے ان کا خیال ہے کہ یہ خدا کا کلام ہے۔''

قرآن کے احکام مطابق حکمت وعقل واقع ہوئے ہیں

دائرۃ المعارف عامہ (پاپولر انسائیکلوپیڈیا) جلد

ہشتم کے صفحہ ۳۲۶ میں مسطور ہے:

''قرآن کی زبان بلحاظ لفظ عرب زیادہ فصیح ہے۔ اس کا طرز بیان اور اس کی انشائی خوبیاں ایسی دلآویز و دلکش ہیں کہ اس وقت تک ان کی مثل اور نظیر پیش نہیں کی جاسکی۔ اس کے اخلاقی احکام اس قدر مطابق عقل و حکمت واقع ہوئے ہیں کہ اگر انسان ان پر پورے طور پر عمل پیرا ہو تو وہ اس کو ایک پاکیزہ زندگی بسر کرنے پر آمادہ کر دیتے ہیں۔''

قرآن راعی ورعایا دونوں کے لئے کافی ہے

ڈیوڈ ارکو ہرٹ اپنی کتاب ''روح المشرق'' کے دیباچہ میں اسلام کی تصویر حسب ذیل الفاظ میں کھینچتا ہے:

''اسلام بطور ایک مذہب کے کوئی جدید اعتقاد، جدید وحی اور جدید خیال پیش نہیں کرتا۔ اس نے نہ قسیسیت کی بنیاد رکھی ہے اور نہ کلیسائی حکومت کی۔ وہ رعایا کو ایک ضابطہ اور سلطنت کو ایک نظام ترکیبی پیش کرتا ہے۔ جس کو مذہب کی منظوری و تائید سے طاقت دی گئی ہے۔''

قرآن میں کوئی بات مشتبہ نہیں ہے

فرانسیسی فاضل ایم۔ دی سینٹ ہلیئر اپنی کتاب متعلقہ قرآن میں لکھتا ہے:

''قرآن میں کوئی بات مشتبہ یا قدرت کی باتوں سے بڑھ کر بطور عجوبہ نہیں ہے۔ مذہب اسلام خود اس بات کے مخالف ہے کہ وہ کسی پردہ میں پوشیدہ کیا جائے اور اب تک اس میں چند شبہات موجود ہیں تو اس کا الزام مذہب اسلام پر نہیں کیونکہ وہ ابتدا ہی سے ایسا صاف اور سچا ہے۔ جتنا کہ ہو ناممکن ہے۔''

قرآن سے زیادہ کسی کتاب کا احترام نہیں کیا جاتا

''چیمبرز انفریمیشن فار دی پیپل'' کے صفحہ ۴۲۱ میں لکھا ہے:

''قرآن کی زبان انتہا درجہ کی خوبصورت اور خالص ہے............ کسی اور کتاب کا اتنا احترام نہیں کیا جاتا جتنا کہ مسلمان قرآن کا کرتے ہیں۔ حتیٰ کہ اس کو بغیر طہارت کے ہاتھ بھی نہیں لگایا جاتا۔ ہر ایک مشکل میں اس سے فیصلہ چاہا جاتا ہے اور اسی کو حکم بنایا جاتا ہے اور ہر ایک مقام پر اس کی آیات نمایاں کی جاتی ہیں۔''

قرآن نے ذہنی انقلاب پیدا کر دیا

مسٹر وڈ ڈا ایڈ اپنی تالیف ''انسان کی شہادت'' میں لکھتے ہیں:

''جس زمانہ میں یورپ بے علمی اور جہالت میں ڈوبا ہوا تھا۔ اسلامی ہسپانیہ کے عہد میں علم وفضل کا دور دورہ تھا اور وہاں کیمیائی تجربے کئے جا رہے تھے اور یہ ذہنی انقلاب تمام تر کتاب اسلام (قرآن) کی بدولت ظہور میں آیا۔''

قرآن مردم خوری تک چھڑا دیتا ہے

مسٹر جوزف تھامسن تحریر فرماتے ہیں:

''وسطی سوڈان اور مغربی سوڈان میں قرآن کے وعظ کا یہ اثر ہوا ہے کہ جوزانو پہلے پتھروں کے روبرو جھکتے تھے۔ وہ اب خدا کے روبرو جھکتے ہیں اور وہ ہونٹ جو ایک بھائی کے گوشت کے مزہ سے خوش ہوتے تھے۔ اب اس کی عظمت اور رحم کو تسلیم کرنے میں مصروف ہیں۔''

قرآن ہمیشہ باقی رہنے والا معجزہ ہے

مسز اینی بیسنٹ اپنے ایک لیکچر میں فرماتی ہیں:

''خود آں حضرت لکھے پڑھے نہ تھے اور اس لئے دنیا علم کا جو مفہوم سمجھتی ہے۔ اس لحاظ سے وہ عالم نہ تھے۔ آپ بار بار اپنے کو نبی امی کہتے ہیں اور آپ کے پیرو قرآن کو ہمیشہ باقی رہنے والا معجزہ مانتے ہیں۔ جس سے آپ کا دعویٰ رسالت بھی سچا ہوتا ہے کیونکہ یہ نہایت اعلیٰ زبان میں ہے۔''

قرآن سب کے لئے ہے

اڈمنڈ برک نے ''امپیچ منٹ آف وارن ہیسٹنگز'' میں قرآن کریم کی بڑی تعریف کی ہے' اور لکھا ہے:

''اسلامی قانون ایک تاجدار سے لے کر ادنیٰ ترین افراد رعایا تک کو حاوی ہے۔ یہ ایک ایسا قانون ہے' جو ایک معقول تریں علم فقہ پر مشتمل ہے۔ جس کی نظیر اس سے پیشتر دنیا پیش نہیں کر سکی۔''

قرآن کو پڑھ کر آدمی مسلمان ہو جاتا ہے

مسٹر ایچ۔ پی فلشر ''اسلامک ریویو'' میں لکھتے ہیں:

''میں نے قرآن پاک کی ایک جلد خریدی۔ اس کا مطالعہ شروع کیا۔ اپنے عرب دوستوں کے ساتھ گفتگو کی اس طرح میں نے اسلام کی زبردست طاقت وعظمت کو محسوس کیا اور مسلمان ہو گیا۔''

قرآن برتری وفضیلت کا احساس پیدا کرتا ہے

پروفیسر ڈی۔ ایس مارگولیتھ جس نے قرآن اور اسلام کے متعلق مخالفانہ لٹریچر میں کافی اضافہ کیا ہے۔ اپنی کتاب ''محمدن ازم'' کے صفحہ ۲۴۵ میں لکھا ہے:

''بے شبہ قرآن کریم نے عربوں کی جو خدمت انجام دی ہے اس کو مبالغہ کے ساتھ بیان نہیں کیا جا

سکتا۔ اس امر نے کہ قادر مطلق نے اپنا پیغام بنی نوع انسان کو انہی کی زبان میں بھیجا۔ ان میں برتری وسلطنت کا احساس پیدا کر دیا۔ اور یہ بات کسی نہ کسی وقت میں بہت سی عظیم الشان قوموں کی ترقی کا باعث ہوئی۔''

قرآن تاریخی واقعات کو محض تنبیہ کے لئے پیش کرتا ہے

یہی مصنف اپنی اسی تالیف میں ایک دوسری جگہ لکھتا ہے:

''قرآن دیگر مذہبی صحائف کی نسبت جو براہ راست تاریخی معاملات پر بحث کرتی ہیں۔ مختلف حیثیت رکھتا ہے۔ جہاں تک قرآن کا تعلق ہے وہ تاریخ کو صرف اخلاقیات کے نشر و نفاذ کے لئے پیش کرتا ہے۔ حتیٰ کہ قرآن میں جہاں تک واقعات حاضرہ کو بیان کیا گیا ہے وہاں بھی یہی مقصد پیش نظر ہے۔ اس کو کسی حکایت یا واقعہ کا بیان مقصود نہیں ہوتا بلکہ صرف یہ مقصود ہوتا ہے کہ سننے والے کو تنبیہ ہو۔''

قرآن کی بے مثل تعلیمی قوت

گوئٹے Goethe نے قرآن کی تعلیمی قوت پر گفتگو کرتے ہوئے ایکرمن سے کہا:

''تم دیکھتے ہو کہ اس قرآن کی تعلیم کو کبھی ناکامی کا منہ دیکھنا نہیں پڑا۔ اپنے تمام نظامہائے تعلیم سمیت اگر ہم کوشش کریں تو اس تعلیم سے آگے نہیں بڑھ سکتے اور عمومی نظر سے دیکھا جائے تو اس تعلیم سے تجاوز کرنے کی کسی شخص کی طاقت نہیں ہے۔''

قرآن فرحت آمیز تحیر میں ڈالنے والی کتاب ہے

فاضل موصوف اپنی ایک تصنیف میں لکھتے ہیں:

''جس قدر ہم اس (کتاب) کے نزدیک پہنچتے ہیں۔ یعنی اس پر زیادہ غور کرتے ہیں۔ وہ اسی قدر دور کھچتی جاتی ہے۔ یعنی زیادہ اعلیٰ معلوم ہوتی ہے۔ وہ بتدریج فریفتہ کرتی ہے۔ پھر متعجب کرتی ہے۔ فرحت آمیز تحیر میں ڈال دیتی ہے اور آخر کار اپنا احترام کرا کے چھوڑتی ہے۔ اس طرح یہ کتاب تمام نظروں میں ہمیشہ زبردست اثر ڈالتی ہے۔''

قرآن کی بھاشا بہت سندر ہے اور وہ توحید سکھاتا ہے

گورو کل کانگڑی کے پرنسپل رام دیو ایم۔ اے نے وچھووالی آریہ سماج لاہور میں ''آریہ سماج اور مسلمان'' کے موضوع پر تقریر کرتے ہوئے کہا:

''قرآن کی بھاشا (زبان) بہت سندر ہے۔ اس میں فصاحت و بلاغت بھری ہے۔ اس سے کوئی انکار نہیں کر سکتا ہے کہ قرآن کے اندر کئی اچھی باتیں ہیں۔ قرآن کی توحید میں کسی کو شک نہیں۔ صاف بتایا ہے کہ اللہ ایک ہے۔ عرب کے اندر عورتوں کا کوئی درجہ نہ تھا۔ محمد ﷺ صاحب نے عورتوں کے حقوق قائم کئے۔''

(پرکاش' ۱۹ فروری ۱۹۲۷ء' صفحہ ۳)

قرآنی بہشت محض تمثیلی ہے

پروفیسر اے۔ اے بیون Professor A.A.B. مشہور مستشرق لکھتے ہیں:

''قرآن میں بہشت کے جو برکات و خصائص بیان کئے گئے ہیں ان کو محض تمثیلی سمجھنا چاہئے اور اس کے سوائے اس کی کوئی اور معنی لینا جائز نہیں۔ اس بارہ میں (آیات قرآنی کے) لغوی معنی لینا راست پسندی کے قطعی منافی ہے۔''

(اسلامک ریویو' فروری ۱۹۳۶ء)

قرآن میں اللہ تعالیٰ کے صفات خوبصورتی سے بیان کئے گئے ہیں

مسٹر جے۔ ایف ہولڈن Mr.J.F. Holdon نے فرینڈز اڈلٹ سکول فوکسٹون میں ''اسلام'' پر تقریر کرتے ہوئے کہا:

''اسلام کا اصول اولیں اللہ تعالیٰ کی توحید۔ اس کی لازوال طاقت۔ اس کی بے مثل رحم اور اس کی غایت درجہ کی محبت کے اعتقاد میں مضمر ہے۔ ذات باری کے صفات قرآن کریم میں نہایت خوبصورتی سے بیان کئے گئے ہیں۔''

(اسلامک ریویو' اگست ۱۹۱۳ء' صفحہ ۲۴۷)

قرآن اپنا ادب آپ کراتا ہے

ڈاکٹر جے۔ ڈبلیو۔ لائٹز بانی پنجاب یونیورسٹی جو عربی کے ماہر تھے اور جنہوں نے قرآن کریم کے کئی حصے حفظ کئے تھے۔ اپنے ایک خط میں رقم فرماتے ہیں:

''وہ عیسائی جو درحقیقت علم عربی پڑھے ہوئے ہیں۔ قرآن کے معانی اور تفسیر کو اچھی طرح سمجھتے ہیں اور مسائل مفتیٰ و غیر مفتیٰ بہ میں تمیز کر سکتے ہیں (بشرطیکہ منصف مزاج اور غیر متعصب ہوں) ہمیشہ مذہب اسلام کا ادب کرتے رہے ہیں۔''

قرآن میں شریفانہ احساسات کی تعلیم دی گئی ہے

''پاور اینڈ پریجوڈس'' میں جو انگریزی کی ایک نہایت مشہور کتاب ہے لکھا ہے:

''قرآن کی رمزیت اور اس کی ارکان اساسیہ کی

سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ ایک ایسی کتاب ہے جس میں سچے اور شریفانہ احساسات اور کریمانہ اخلاق کی تعلیم دی گئی ہے۔''

قرآن خدا کی طرف سے نازل ہوا

مشہور سیاح سر جان ماندویل اپنی تالیف میں لکھتے ہیں:

''مسلمان نیک اور ایماندار ہیں۔ وہ اپنے صحیفۂ پاک یعنی قرآن کے نہایت پابند ہیں جس کو خدا نے محمد ﷺ پر اتارا اور حضرت جبریلؑ خدا کا اکثر حکم ان پر ظاہر کرتے تھے۔''

قرآن ہی کے مطابق دنیا پر حکومت ہونی چاہئے

نپولین بوناپارٹ لکھتا ہے:

''میری یہ خواہش ہے کہ دنیا پر قرآن پاک کے اصول و آئین کے مطابق حکومت کی جائے۔ اس لئے کہ صرف انہی میں بنی نوع انسان کی حقیقی فلاح و بہبود مضمر ہے۔''

(بحوالہ مسلم ریویو بابت جنوری ۱۹۳۴ء، صفحہ ۱۲)

قرآن کے صفحات پر خود خدا جلوہ فرما ہے

عثمان واٹکنز جن کو خدا نے عیسائیت کو ترک کر کے اسلام قبول کرنے کی توفیق بخشی فرماتے ہیں:

''رب العلمین ہمارے فہم وادراک سے بالاتر ہے ہم اس کو صرف اس کے کاموں کے ذریعہ جان سکتے ہیں اور اس کا جلوہ ہم قرآن پاک کے غیر فانی صفحات پر دیکھتے ہیں۔''

قرآن جملہ آسمانی صحائف میں سب سے بہتر ہے

مسٹر شام لال مہتہ بی۔کام۔ ایف آئی سی۔اے (لندن) مسلم ریویو لکھنؤ بابت نومبر و دسمبر ۱۹۳۳ء میں اپنے اسلام لانے کے وجوہ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''قرآن پاک جملہ آسمانی صحائف میں سب سے بہتر ہے۔ یہ بجائے خود ایک مستقل معجزہ ہے۔ اور خدا کی وحدانیت کی مکمل تعلیم دیتا ہے۔''

قرآن سے ہندو شاستر کو بدلنا ضروری ہے

مسٹر رچرڈسن نے ''قانون ازالہ غلامی'' انڈیا کونسل میں پیش کرتے وقت ۱۸۱۰ء میں فرمایا تھا:

''غلامی کی مکروہ رسم اٹھانے کے لئے یہ ضروری ہے کہ ہندو شاستر قرآن سے بدل دیا جائے۔''

قرآن کا قانون بائبل سے زیادہ موثر ہے

مشہور مسیحی پادری ڈین سٹینلی نے ''مشرقی کلیسا'' کے صفحہ ۲۷۹ میں لکھا ہے:

’’قرآن کا قانون بے شبہ بائبل کے قانون سے زیادہ موثر ثابت ہوا ہے۔‘‘

قرآن کی فصاحت عیسائیوں کو اس کے مطالعہ پر مجبور کرتی ہے

قرطبہ کا مشہور دشمنِ اسلام بشپ الورد قرآن کی فصیح عبارت کی نسبت یہ کہنے پر مجبور ہوا کہ:

’’عیسائی بھی اس کو پڑھے اور تعریف کئے بغیر نہیں رہ سکتے۔‘‘

قرآن بلند خیالات کا مجموعہ ہے

واشنگٹن ارونگ نے ’’سیرت محمدؐ‘‘ میں لکھا ہے:

’’قرآن میں نہایت بلند اور پُر از اخلاص خیالات مندرج ہیں۔‘‘

قرآن بے شبہ ایک الہامی کتاب ہے

ہندو دنیا کے لیڈر اعظم ’’مسٹر گاندھی‘‘ ’’ینگ انڈیا‘‘ میں لکھتے ہیں:

’’مجھے قرآن کو الہامی کتاب مان لینے میں ذرہ برابر بھی تامل نہیں ہے۔‘‘

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

یکے از مطبوعات باغبان ایسوسی ایشن

ہمارا ماٹو ''قرآن فہمی اور باغبانی''

قرآن کریم میں ہے:

ما کان لبشران یؤتیه الله الکتٰب والحکم والنبوة ثم یقول للناس کونوا عبادا لی من دون الله ولٰکن کونوا ربٰنین بما کنتم تعلمون الکتٰب و بما کنتم تدرسون (3:78)

''کسی انسان کو اس کا حق حاصل نہیں کہ خدا اسے ضابطۂ قوانین' حکومت اور نبوت عطا کرے اور وہ لوگوں سے یہ کہنا شروع کر دے کہ تم خدا کے احکام کی جگہ میرے احکام کی اطاعت کرو۔ اسکی تعلیم یہی ہوگی کہ تم سب اس کتاب خداوندی کی اطاعت سے جس کی تم دوسروں کو تعلیم دیتے ہو اور جس پر غور و تدبر سے اس کے مغز تک پہنچتے ہو۔ ربانی (یعنی اس کے نظام ربوبیت کے علمبردار) بن جاؤ۔'' (مفہوم القرآن)۔

ربانی معاشرہ ہر قسم کی غلامی کا خاتمہ کر کے ہی قائم کیا جا سکتا ہے۔ جس کی بنیاد الارض للہ ہے۔

کس نباشد در جہاں محتاجِ کس
نکتۂ شرعِ مبیں ایں است و بس

(اقبال)

☆ 2007ء باغبانی کا سال ہے آپ بھی اپنے کردار کا بھرپور عملی مظاہرہ کر کے دکھائیں۔

☆ باغبان حضرات ہر مہینے کی 15-30 تاریخ کو اپنے غیر رسمی اجتماعات میں اپنے تجربات اور معلومات سے دوسروں کو آگاہ کرتے ہیں۔

☆ کاربن۔ ہائیڈروجن اور آکسیجن پودے ہوا اور پانی سے حاصل کرتے ہیں۔

☆ نائٹروجن۔ فاسفورس۔ پوٹاشیم۔ کیلشیم۔ میگنیشیم اور سلفر 6 عناصر کُبریٰ غذائی ہیں۔

☆ بوران۔ زنک۔ آئرن۔ کاپر۔ میگنیز۔ مولب ڈینم اور کلورین 7 عناصر صُغریٰ غذائی ہیں۔ یہ تمام اجزاء بطور خوراک پودا کھاد مہیا کرنا جدید زرعی ٹیکنالوجی کا حصہ ہیں۔

☆ مرغیوں کی بیٹ بھی کھاد میں پودوں کے لئے مفید ہے۔

☆ پتے۔ گھاس۔ بچا کھچا چارہ۔ سبزیات کے فالتو حصے' باورچی خانے کا بقایا' کھاد کے گڑھے میں ڈالتے رہیں۔

پتہ رابطہ: (1) ملک حنیف وجدانی' صدر باغبان ایسوسی ایشن' سنبل سیداں' نیو مری۔ (2) صبینہ یاسمین' سینئر نائب صدر' باغبان ایسوسی ایشن' ٹبی سیداں' سوہاوہ' جہلم۔ (3) محمد افضل ولد عبدالحمید' چک نمبر 215 (تاحیات ممبر)' باغبان ایسوسی ایشن' بورے والا' وہاڑی۔

INSHAALLAH-It is a team effort.

By

A. Rashid Samnakay, Australia

======================

Dear Uzminah and Abid-

I am sorry too. On the basis that we have a certain empathy with Pakistan, I share yours and your generation's disappointment regarding Pakistan's cricket team's behavior and performance at the World Cup and the Coach's death! Truly it was heart wrenching. But many experts would say that they could see the whole thing coming years ago except for Pakistan Cricket Board.

Your reading of the media is absolutely correct. This over-the-top display of religiosity in every aspect of its life is nothing more than *numaaish-* advertisement of their false piety. Alas! Piety and good character are as different as chalk and cheese.

God-consciousness is the prerequisite for ones interaction with God's creation, particularly with human beings. One's every **thought** is supposed to be tinged with the desire that every action will result in 'good'-*salaah* and Character is that **positive trait** which makes one act in the 'best interest' - *flaah.* of every body concerned, including oneself.

Being god-conscious, one is aware of the requirement that Quran, which the pious people proclaim to be adhering to, abhors advertisement and self–promotion 107-6, that is numaaish.

To give one example of this, to begin an interview by the Captain with Western media with Arabic incantations and that too in Jamaica, where no body would have understood what it all meant, to them it must have appeared very comical.

God-conscious persons have this consciousness written on their heart and modesty and humility, which forms part of ones character,

demands that they keep it lodged there. Where as the *numaaish*- the display, is akin to wearing an Allah-medallion on bare breast.

Sports is entertainment, health promotion, instilling discipline, social interaction, team building and in modern times a venue of National pride and its projection. Wealth generation for the nation and individual players is now a major aspect of international sports. For all this to be 'good' and produce fruitful reaction, a solid good character is an essential requirement. We have seen how even overt piety of some did not protect them from the temptation of big money- although they blamed the poor satan- and now not many of their fans remember them.

If ever there was an example of what happens to a nation when its paradigm shifts from *amilus-saalihaat* based on *amal*-action, to religious bigotry and window dressing, then today's Pakistan's cricket team is a prime example! Ever since this hypocrisy has crept in, the focus on 'task ahead' is lost. 'Praying' for victory has taken over 'Playing' for victory and the result is obvious for all to see! One hopes the nation of Pakistan learns from the demise of its cricket team.

One wonders, what ever has happened to the Pakistan Hockey and Squash sport, which along with Cricket years ago had made Pakistan a name to be taken with awe and respect! Alas! No more.

It is a case of :

Suraiya sey zameen par aasman ney hum ko dey maaraa --Quran tells us that-

"….God has promised 'good' to those who strive and struggle. HE distinguished them by a special reward, above those who sit on their haunches (that is take no action), 4-95".

My dear children, don't be disheartened for there might yet be a silver lining round the dark clouds!

Pass on our love to all at home.

Dadajan

🖂🖂🖂🖂🖂🖂🖂🖂